وقت سمندر

شہریار

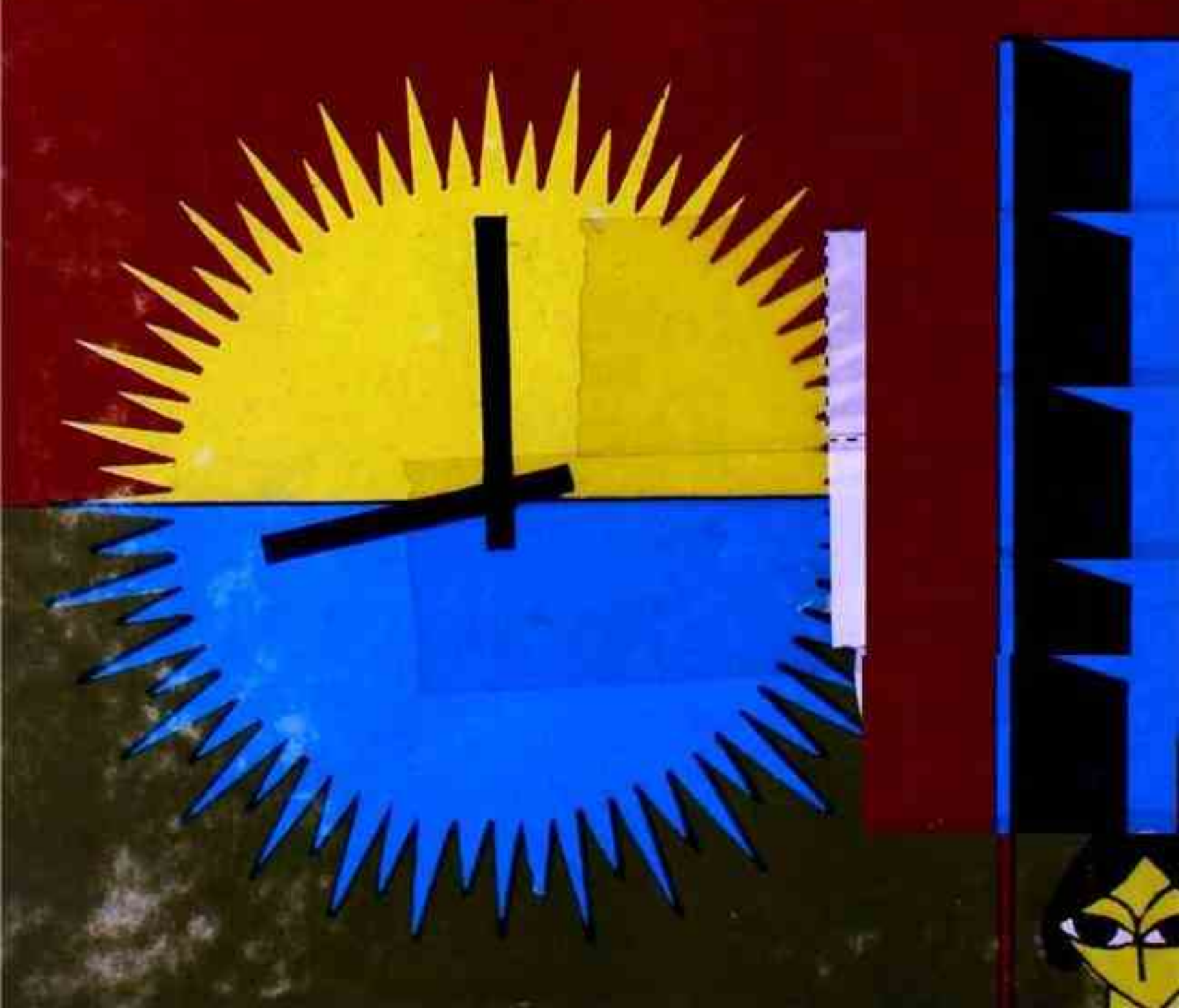

وقت سمندر

وقت سمندر

(افسانے)

محمد منشاد

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے
ہیں مزید اس طرح کی شان دار،
مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے
ہمارے وٹس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پینل

عبداللہ عتیق : 03478848884

سدرہ طاہر : 03340120123

حسنین سیالوی : 03056406067

ماڈرن بکڈپو، آبپارہ، اسلام آباد

جملہ حقوق بحق مصنّف محفوظ

نام کتاب ــــــ وقت سمندر

مصنف ــــــ محمد منشا یاد

بار اوّل ــــــ دسمبر ۱۹۸۶ء

تعداد ــــــ ایک ہزار

کتابت ــــــ نوید کمال

ناشر ــــــ سید ذاکر شاہ

طابع ــــــ برق سنز پرنٹرز۔ اسلام آباد

قیمت ــــــ ساٹھ روپے

ماڈرن بک ڈپو، آبپارہ، اسلام آباد

فرخ اور شانی کے نام ــــــ!

ترتیب

۱۔ اپنا اپنا کاگ ——— ۱۵

۲۔ دامِ شنیدن ——— ۲۱

۳۔ دُنیا کا آخری بھُوکا آدمی ——— ۳۱

۴۔ غروب ہوتی صبح ——— ۳۷

۵۔ وقت سمندر ——— ۴۹

۶۔ رابطہ ——— ۵۹

۷۔ رہائی ——— ۶۵

۸۔ لوہے کا آدمی ——— ۷۳

۹۔ سارنگی ——— ۸۱

۱۰۔ گیارھواں میل ——— ۹۱

۱۱۔ زیرو زیرو ——— ۱۰۳

۱۲۔ ببول سے لپٹی ہوئی بیل ——— ۱۱۳

۱۳۔ بیتال کتھا ——— ۱۲۱

۱۴۔ اوپر جانے والا ——— ۱۳۱

۱۵۔ اگلی صف کا آدمی ——— ۱۴۳

۱۶۔ ایندھن ——— ۱۴۹

۱۷۔ خوف ۸۵ء ——— ۱۶۱

۱۸۔ زوال سے پہلے ——— ۱۷۱

۱۹۔ دیکھا ہوا منظر ——— ۱۸۱

۲۰۔ بچے اور بارود ——— ۱۸۷

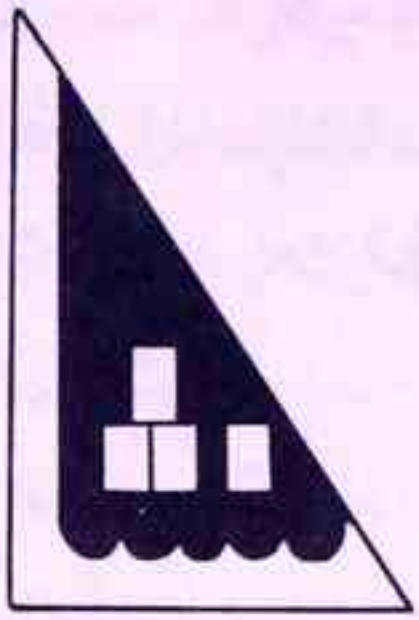

ایک روز سکول سے واپس آکر میں نے ماں جی کو بچّوں کا ایک رسالہ دکھایا اور شکایت کی کہ دیکھیں اس میں لڑکوں کے کیسے اچھے اچھے نام چھپے ہوئے ہیں۔ آپ نے میرا کیا یونہی سا نام رکھ دیا ہے۔ آپ جانتے ہیں ہر ماں کو اپنی اولاد سب سے خوبصورت اور ان کے نام سب سے اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ ماں جی کہنے لگیں کہ تیرا نام تو بہت خوبصورت، برکت والا اور تاریخی ہے۔ جب میری تشفی نہ ہوئی تو انہوں نے مجھے ایک واقعہ سُنایا۔

جب حضرت یوسفؑ نے اپنے چھوٹے بھائی بنیامین کو اپنے پاس مصر میں رکھنے کے بہانے قید کر لیا تو باقی کے دس بھائی بہت سٹپٹائے، وہ اس وقت تک نہیں جانتے تھے کہ حاکمِ مصر ان کا اپنا بھائی یوسف ہے۔ جسے انہوں نے غلام بنا کر فروخت کر دیا تھا پہلے تو انہوں نے منّت سماجت کی مگر جب کامیابی نہ ہوئی تو انہوں نے بنیامین کو بزورِ شمشیر رہا کرانے کا ارادہ کر لیا۔

حضرت یعقوب کی اولاد کی بہادری اور شہ زوری مسلّمہ تھی وہ جب میدان میں نکلتے تھے تو لاکھوں جوانوں پر غلبہ حاصل کر لیتے تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا میں پاؤں کی ٹھوکر سے پورے شہر کو ہلا کر رکھ دوں گا۔ دوسرے نے کہا۔ مَیں ایسا ہیبت ناک نعرہ لگاؤں گا کہ مصر شہر کی تمام حاملہ عورتوں کے حمل ساقط ہو جائیں گے۔ تیسرے نے جس کا نام روئیل تھا پیش کش کی کہ وہ اکیلا شاہی لشکر کو روک سکتا اور اس کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ شمعون نے دعویٰ کیا کہ وہ مصر کے گلی کوچوں اور بازاروں میں نکل جائے گا اور اس کے ہاتھ سے کوئی زندہ بچ کر نہیں جائے گا یہودا کہنے لگا کہ شاہی دربار اور امیروں وزیروں کو سرنگوں کرنا میرا ذمّہ ہے۔

یہودا کے بارے میں حضرت یوسفؑ بھی جانتے تھے کہ جب وہ غضب میں آتا تھا اس کے منہ سے بادل کی گرج کی سی چنگھاڑ نکلتی تھی جس سے سننے والے بے ہوش اور ہلاک ہو جاتے تھے۔ غصّے اور جوش کے عالم میں اس کے

جسم کے تمام بال نوکیلے کانٹوں کی طرح کھڑے ہوجاتے اور لباس کو چھید کر باہر آجاتے تھے۔ اس لئے انہوں نے اپنے بیٹے کو حکم دیا کہ جب وہ جوش میں آنے لگے وہ جا کر اس کی پشت پر ہاتھ رکھ دے۔ چنانچہ جب یہودا غصے میں آیا اور نعرہ مارنا چاہتا تھا تو لڑکے نے آکر اس کی پشت پر ہاتھ رکھ دیا اور جس طرح بجلی کے کوندے کو زمین دوز (ارتھ) کر دیا جاتا ہے یہودا کا سارا غیض و غضب جاتا رہا۔

سر دیا ہویا تن غضبوں اس دا قوت خارج ہوئی
پرت ڈٹھا اک سوہنا لڑکا ہور نہ نیڑے کوئی
بہت عجائب سندر سوہنا روشن چمک جمالوں
جُدا کیتا رُب یوسف دو جا حضرت یوسفؑ نالوں (مولوی عبدالستار)

کہتے ہیں کہ حضرت یوسفؑ کے اس بیٹے کا نام منشا تھا۔ (بعض روایتوں میں اسے میشا، منسی اور چھوٹا بیٹا افرائیم بھی بتایا گیا ہے)

ماں جی کہنے لگیں بیٹا۔ نام میں بڑی برکت ہوتی ہے۔ میری خواہش اور دعا ہے کہ تم میں اس نام کی خوبی پیدا ہوجائے تم شر کو چھو کر خیر میں بدل سکو۔

پتہ نہیں مرحومہ ماں جی کی خواہش اور دعا کہاں تک پوری ہوئی مگر اتنا ضرور ہے کہ میں جہاں کہیں ظلم، زیادتی، جبر اور ناانصافی دیکھتا ہوں اداس اور رنجیدہ ہوجاتا ہوں۔ پیٹھ پر ہاتھ تو کوئی رکھنے نہیں دیتا۔ میں قلم کی نوک سے منفی اور حاسدانہ رویوں کو چھو کر تبدیلی کی خواہش کرتا ہوں۔ خواہش تو کی جاسکتی ہے نا!

○ لوگو۔ اگر تم زندہ رہنا چاہتے ہو، اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری بستی وقت سے پیچھے نہ رہ جائے تو انصاف قائم کرو۔ انصاف ہی نیکی اور راست بازی ہے اور تم ظلم اور ناانصافی کرنے والے ہاتھوں کو پہچانو اور انہیں ایسا کرنے کی ہرگز اجازت نہ دو، ورنہ تمہارا شمار ظالموں میں سے ہوگا۔" (دھوپ دھوپ دھوپ)

○ ہوا چل رہی ہے مگر حبس سے دم گھٹا جاتا ہے۔ پتہ نہیں ہوا کو کیا ہوگیا ہے شاید اس میں سے کچھ نکال لیا گیا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے ساری ہوا باسی ہوگئی ہے اور خود تازہ جھونکوں کی تلاش میں اِدھر اُدھر ٹامک ٹوئیے مارتی پھرتی ہے۔ منڈیروں کو چھو کر گزرتے ہوئے اس کی کراہیں اور ہچکیاں سنائی دیتی ہیں۔ کہیں سچ مچ ساری دنیا میں ہوا کی راشننگ تو نہیں ہوگئی؟ (بانجھ ہوا میں سانس)

○ "ماں پتر۔ یہ رب کی قدرت ہے۔ یہ عورت ہے نہ مرد۔ یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ پھر اس نے آگ پر گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے بھونتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا اور ٹھنڈی آہ بھر کر بولا۔ "جب رب اسے بنانے لگا مٹی کم پڑ گئی۔ رب کو اور بہت سے کام ہوتے ہیں اس نے اور بہت کچھ بنانا ہوتا ہے۔ (ماس اور مٹی)

○ "عجیب بات ہے کہ ایک شخص دوسروں کے ساتھ (تانگے میں) بیٹھنا پسند نہیں کرتا محض اس لئے کہ کاغذوں میں اس کے نام اس کی ضرورت سے زیادہ اراضی لکھی ہوئی ہے مگر اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ کس دور میں رہتا ہے۔"

"وہ اپنے علاقے میں صاحبِ اقتدار ہے اور اپنے عہد میں رہتا ہے اس وقت میں اور تم بھی چودھری نور محمد کے عہد میں سانس لے رہے ہیں۔" (مائی فٹ)

○ مگر اب مولوی اللہ رکھا کی امامت کا دائرہ اپنی مسجد سے نکل کر آس پاس کے کئی ایک چھوٹے بڑے دیہات کی مسجدوں تک پھیل گیا ہے۔ ان مسجدوں میں ان کے نائب امام آمدنی کے ایک تہائی حصے پر کام کرتے ہیں... ان کا شمار اچھے کھاتے پیتے لوگوں میں ہوتا ہے۔ بڑے بڑے زمینداروں نے ان سے منافع پر موٹی موٹی رقمیں لیکر ٹیوب ویل لگوائے اور ٹریکٹر خریدے ہیں۔ (آدم بو)

○ اس کے کہنے پر دفتر میں ہر روز صفائی کی جانے اور دوائی چھڑکی جانے لگی مگر بدبو کے احساس نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ تنگ آکر ایک دن اس نے اپنے عملے کی مدد سے الماریوں، شیلفوں اور میز کی درازوں میں سکھے کاغذات اور فائلوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا مگر کوئی زندہ یا مردہ چیز کہیں سے برآمد نہ ہوئی پھر بھی اسے یقین تھا کہ کہیں قریب ہی کوئی چیز گل سڑ رہی تھی۔ (شب چراغ)

○ ہمارے سروں پر شکر دوپہر تن گئی ہے اور ڈھلنے کا نام نہیں لیتی۔ ہماری مرغیاں پتھریلے انڈے سیتی سیتی ہلکان ہو گئی ہیں۔ (۱۹۷۸ء کا آخری افسانہ۔ پناہ)

○ جب بھی بور آتا اور پھل لگنے تو قریبی جنگل سے ہریل طوطوں کی ایک ڈار آجاتی اور کچے پھلوں کو کتر کتر کر نیچے پھینکنے لگتی۔ یوں ہر بار پھلوں کے پکنے سے پہلے سارے پیڑ ویران اور بے ثمر ہو جاتے۔ (کاشی)

○ گھر میں سب روکھی سوکھی کھا کر گزارہ کرتے تھے مگر میں ابا کا کھانا جو گھر میں علیحدہ پکتا تھا اور بہت لذیذ ہوتا تھا، موقع پا کر چکھ لیتا تھا، مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس طرح وہ میرے زہر سے آہستہ آہستہ مرتا چلا جائے گا۔ (کنٹوپ)

○ کنارے پر جگہ جگہ ادھ کھائی اور مری ہوئی مچھلیاں بکھری پڑی ہیں چھوٹا کہتا ہے۔ "یہ اُدھڑوں کی کارستانی لگتی ہے ابا۔"

"ہاں بیٹر" بڑا کہتا ہے۔ "یہ ایسا ہی کرتے ہیں ضرورت سے زیادہ مچھلیاں مار مار کر جمع کرتے رہتے ہیں مگر کھاتے وقت آپس میں لڑ پڑتے ہیں اور شکار کو خراب اور ایک دوسرے کو لہولہان کر دیتے ہیں۔"

"یہ اتنی ساری مچھلیاں" چھوٹا کہتا ہے۔ "ایک رات میں اتنی مچھلیاں مارتے ہیں تو دریا مچھلیوں سے خالی نہیں ہو جائیگا۔"

"اگر ادھروں کی تعداد بڑھتی رہی تو ایسا ہو سکتا ہے۔" (تماشا)

○ ایک بار چھوٹے ماموں کا چتا مرغ پڑوس والے نانبائیوں کے مرغ سے ہار گیا تو انہوں نے دو روز تک کھانا نہ کھایا۔ پھر ایک روز وہ سکول سے آ کر چھت پر گیا تو اس نے دیکھا چھوٹے ماموں نے نانبائیوں کے کالے مرغے کو دونوں ہاتھوں سے پکڑا ہوا تھا اور ان کا چتا مرغ اس کی کلغی پر بے رحمی سے چونچیں مار رہا تھا۔ (کنٹوپ)

○ اس نے ماسٹر کلاک نہیں دیکھا تھا مگر اس نے سنا تھا کہ مختلف کمروں میں لگے ہوئے کلاک، ماسٹر کلاک سے کنٹرول ہوتے ہیں، سب کے الارم ایک ساتھ بجتے ہیں اور سب کی سوئیاں ماسٹر کلاک کے تابع ہوتی ہیں۔ اس نے یہ بھی سنا تھا کہ ماسٹر کلاک پر وقت عموماً درست ہوتا ہے لیکن اگر کبھی وقت ماسٹر کلاک سے آگے نکل جاتا یا پیچھے رہ جاتا ہے تو ماتحت کلاک بھی غلط وقت بتانے لگتے ہیں۔ (اوور ٹائم)

یوں تو میں نے قصے کہانیوں کی بے شمار کتابیں پڑھیں۔ ناول، افسانے، ڈرامے، حکایتیں، تمثیلیں، منظوم قصے، داستانیں اور مثنویاں۔ مگر یوسف زلیخا کے کردار اور واقعات جیسے میرے اندر حلول کر گئے اور میرے لہو میں شامل ہو گئے۔ میں نے عالمی ادب کا مطالعہ بھی کیا مگر اپنے شعر نے مجھے بہت تقویت اور توانائی بخشی خصوصاً جذبات کے اظہار میں۔

○ سارنگی سرگوشیاں کرتی۔ کبھی سسکتی، کبھی رو کر پکارتی۔

سارے گھر میں کوئلیں کوکنے لگیں۔ فاختائیں گھگھو گھوہ الاپنے لگیں اور پپیہے بولنے لگے۔ چاروں طرف ڈھولوں کی گھمکاریں سنائی دینے لگیں۔

؎ تیرے حسن دے ڈھول لال دی بمب بولے دھراہ دھراہ او دلبرا واسطہ ای (ہیر وارث شاہ)

○ جن دنوں میں بی اے میں تھا اور کبھی کبھار گاؤں آتا تھا تاجی مجھ سے میاں محمد کی سیف الملوک پڑھنے آ جاتی تھی۔ ایک روز کہنے لگی۔

○ ذرا اس کی تشریح تو کر دسے پاٹی لیر پرانی وانگوں ٹنگ گیوں وچ کِکراں (ببول سے لپٹی ہوئی بیل)

اس کے ہنسنے کا منظر عجیب ہوتا۔ میری آنکھیں چندھیا سی جاتیں۔ میرے اندر سے دُگنی عمر کا مرد نکل کر اس کے قدموں میں بیٹھ جاتا اور کہتا۔

اذن دو تو مَیں ساری دُنیا کے بھیڑیوں کے پیٹ پھاڑ آؤں۔

وہ میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیتی اور مدھم سریلی آواز میں مولوی عبدالستار کی یوسف زلیخا گنگنانے لگتی۔

؎ جدوں پچھاتا خوب زلیخا چھم چھم ہنجوں آیاں

ہے میں ایسے مار مکایاں دیسوں دور کرایاں

○ مجھے وہ لہلہاتے دن یاد آئے تھے جب وہ محض دیکھنے سے گلابی عنابی ہو جاتی اور چھو لینے سے اس کے جسم میں برقی رو دوڑ جاتی تھی مگر اب لگتا تھا جیسے کسی نے پیچھے سے مین سوئچ بند کر دیا ہو۔ اور اس نابینا بڑھیا کی پکار سُن کر یوسف گھوڑے سے اُتر آیا اور اُسے پہچان کر رو پڑا۔

یوسف پچھے دس زلیخا حسن کتھے اج تیرا

کہے زلیخا ہجر رڑھایا ہتھ نہ پہتا میرا

یوسف پچھے دس زلیخا کتھے لب دی لالی

کہے زلیخا جال سدھائی لاٹ فراقاں والی

یوسف پچھے دس زلیخا زلفاں کدھر گئیاں

کہے زلیخا .....

یوسف پچھے ..... (وقت سمندر)

ایک بار ایک معروف نقاد نے مجھے خط کے ذریعے مشورہ دیا کہ مَیں اپنا نام تبدیل کر لوں اور کوئی ایسا نام رکھ لوں جو جدید اور ادبی ہو۔ ان کا خیال تھا کہ میرا نام میری مقبولیت کی راہ میں حائل ہے۔ شہرت اور مقبولیت کی خواہش کسے نہیں ہوتی۔ مَیں نے اس کے مشورے پر عمل کرنے کا ارادہ کر لیا اور اپنے بہت سے اچھے اچھے نام سوچے۔ ایسے نام جن کو پڑھ یا سُن کر ہی پتہ چل جائے کہ کسی ادیب یا شاعر کا نام ہے۔ ایسے چونکا دینے والے نام کہ پڑھنے والوں کو خواہ میری کوئی کہانی، اس کا عنوان یا کردار یاد ہو یا نہ ہو نام ضرور یاد رہ جائے لیکن پھر مَیں نے سوچا کہ جب میں محض چونکانے کے لئے کہانیاں نہیں لکھتا ہوں تو ایسا نام کیوں رکھوں۔ اگر میری کہانیوں میں یاد رکھے جانے والی

کوئی بات ہوگی تو میرے نام کو بھی تقویت مل جائے گی وگرنہ خالی نام یاد رہ بھی گیا تو اس کا کیا فائدہ ؟ اور پھر ماں جی کا دیا ہوا نام ۔ آدمی ماں باپ کا نام روشن نہ بھی کر سکے تو کم از کم ان کے محبت سے جلائے ہوئے اپنے نام کے چراغ کو تو جلتا رہنے دے ۔

ابتدا میں مَیں طنز و مزاح بھی لکھتا تھا۔ اَب بھی منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے کبھی کبھار لکھ لیتا ہوں۔ اس کے علاوہ مَیں شعر بھی کہتا رہا۔ تخلّص اسی زمانے کی یادگار ہے۔ شعر گوئی میں بڑی عزّت، کشش اور لُطف تھا۔ نثر لکھنے کی سی جسمانی مشقت سے بھی واسطہ نہیں پڑتا تھا۔ مشاعرے اور ذرائع ابلاغ کے سہارے بھی موجود تھے۔ اسے چھوڑنا مشکل کام تھا، مگر مَیں نے خود کو کہانی کے لئے وقف کر دیا۔ کیونکہ مَیں بہت کچھ کہنا چاہتا تھا اور میرے خیال میں ہر قسم کے خیالات کی ترسیل کا کہانی سے بہتر اور کوئی ذریعہ نہیں ۔

شاعری کا مطالعہ مَیں اَب بھی دلچسپی سے کرتا ہوں اور یہ جان کر خوش ہوتا ہوں کہ جو کچھ مجھے کہنا تھا یا مَیں کہہ سکتا تھا وہ دوسرے کہہ رہے ہیں اور شاید مجھ سے بہتر کہہ رہے ہیں۔ اس لئے شاعری کا کچھ نقصان نہیں ہوا لیکن کہانی کا معاملہ دوسرا ہے۔

کہانی اور مَیں ایک ساتھ کھیل کر بڑے ہوئے ہیں۔ مَیں شاید ساتویں جماعت میں تھا جب میری پہلی کہانی بچّوں کے ایک رسالے میں شائع ہوئی تھی۔ میرا ذہن ہر وقت کہانیوں سے لبالب رہتا ہے۔ مجھے اتنی فرصت نہیں ملتی کہ مَیں ان سب کو لکھ سکوں۔ مَیں کہانی خود نہیں سوچتا۔ کہانیاں مجھے ڈھونڈ لیتی ہیں اور آسیب کی طرح چمٹ جاتی ہیں۔ میرے ذہن میں شہد کی مکھیاں سی بھنبھناتی رہتی ہیں۔ ایک کہانی لکھ کر ابھی فارغ نہیں ہوتا کہ دوسری چھتہ لگا لیتی ہے۔

میری شائع ہونے والی کہانیوں میں بعض ضرور ایسی ہونگی جو مَیں نہ لکھتا تو اس خیال یا موضوع پر یا اس سے ملتی جلتی کہانی میرا کوئی ہم عصر لکھ دیتا یا میرے بعد میں آنے والے اس کمی کو پورا کر دیتے۔ مگر میں سمجھتا ہوں میری زیادہ تر کہانیاں ایسی ہیں جو مجھے ہی لکھنا تھیں اگر مَیں پیدا نہ ہوتا یا کہانیاں نہ لکھتا تو یہ وجود میں نہ آسکتیں۔ مَیں سمجھتا ہوں ایسی ہی کہانیاں میرے ہونے اور میرے کہانیاں لکھنے کا جواز ہیں اور ایسی ہی کہانیاں میری پہچان اور میرے اطمینان کا باعث ہیں ۔

اسلام آباد ۵ر دسمبر ۸۶ء

محمد منشا یاد

اپنا اپنا کاگ

اس سے پہلے میرا ارادہ نہیں تھا۔
لیکن اب، اس واقعہ کے بعد مَیں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ چلا ہی جاؤں۔
وہاں اگرچہ وہ میرے ساتھ نہیں ہو گا لیکن اس کی کہانی میرے ہمراہ ہو گی۔ مجھے یقین ہے کہ وہاں اب بھی مائیں سونے سے پہلے اپنے بچّوں کو اس کی کہانی ضرور سُناتی ہوں گی اور وہ صبح کو اُٹھ کر اپنے اپنے کاگ کو منڈیروں پر بولتے اور کلول کرتے دیکھ کر خوش ہوتے ہوں گے۔

میری اس کی دوستی بھی تو کہانی ہی کی بدولت ہوئی تھی۔
ماں جی نے بتایا تھا کہ ایک روز اس نے چڑیا کے ساتھ مل کر کھچڑ پکایا۔ چڑیا دال کا دانہ لائی اور وہ چاول کا۔ کھچڑ پک گیا تو چڑیا نے اسے کنوئیں سے پانی لانے کے لئے بھیج دیا وہ پانی بھر کر لوٹا تو اس دوران میں چڑیا پوری ہانڈی چٹ کر کے چکّی کے نیچے چھپ گئی۔ پھر جب اس نے بُونڈا جلایا تو چیخنے چلّانے لگی۔

"ہائے ہائے میرا بُونڈا سڑیا کیوں پرایا کھچڑ کھا ہدا۔"

ماں جی کہانی سُناتیں تو مَیں چڑیا کی چیخیں سُن کر زور زور سے ہنستا، روندمارنے والوں کا یہی انجام ہوتا ہے ان کو سزا ملتی ہے تو سب خوش ہوتے ہیں۔ مجھے چڑیا سے ذرا ہمدردی نہ ہوئی بلکہ کوّے سے میری دوستی ہو گئی۔

پھر ایک مرتبہ ایک کوّے نے جھپٹّا مار کر میرے ہاتھ سے روٹی چھین لی۔ مجھے بہت بُرا لگا مگر مَیں نے سوچا یہ کوئی دوسرا کوّا ہوگا۔ کہانی والا کوّا تو ایسا ہرگز نہیں تھا۔

پھر مَیں سکول جانے لگا اور مَیں نے ایک نظم پڑھی۔

"ایک کوّا پیاسا تھا، جگ میں تھوڑا پانی تھا۔

اس نے پانی کی سطح بلند کرنے کے لئے جو ترکیب نکالی وہ مجھے بہت پسند آئی اور مَیں عش عش کر اُٹھا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ وہ وہی میرا اپنا کاگ ہے۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ اتنے بہت سے کوّوں میں اسے کیسے پہچانوں۔ دیکھنے میں سب ایک جیسے تھے۔ ایک جیسے کالے پر۔ لمبی نوکیلی چونچ اور ایک جیسی کائیں کائیں۔ مگر ایک روز اس کا بھی فیصلہ ہو گیا۔ ہوا یُوں کہ ماں جی کہنے لگیں

"جا دوڑ کر دکان سے سوجی لے آ۔ شاید آج تیرے ماموں آجائیں۔"

ماموں جان کے آنے کی خبر سُن کر مجھے خوشی تو ہوئی اور مَیں بھاگم بھاگ سوجی لینے بھی چلا گیا لیکن دل کو جیسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ماموں جان واقعی آج آجائیں گے۔ ماں جی تو روز ہی کہتی تھیں، آج آجائیں گے، کل آجائیں گے۔ تاہم یہ سوچ کر ڈھارس بندھی کہ ماں جی انتظار تو روز ہی کرتی تھیں مگر انہوں نے سوجی آج ہی منگوائی تھی ضرور انہیں اس کی اطلاع ملی ہوگی۔

دن بھر میرے کان دروازے پہ لگے رہے۔ کئی بار چھت پر چڑھ کر بھی دیکھا مگر ماموں نہیں آئے۔ دل بیٹھنے لگا۔ مجھے ماں جی پر ترس آ رہا تھا جو اتنی سخت گرمی میں چولھے کے پاس بیٹھی حلوہ پکا رہی تھیں۔ ابھی شام نہیں ہوئی تھی کہ اچانک ماموں کی گھوڑی کے ہنہنانے کی آواز سُنائی دی ماں جی ننگے پاؤں دروازے کی طرف دوڑیں۔

"بسم اللہ میرا ویر"

مجھے یقین ہو گیا کہ ماموں جان نے کسی کے ہاتھ اپنے آنے کی اطلاع بھیجی ہوگی جس کی وجہ سے ماں جی کو ان کے آنے کا پتہ تھا۔ مگر جب رات کو مَیں ماموں جان کی لائی ہوئی چھوٹی سی ٹارچ سے جگنوؤں کی نقلیں اُتار رہا تھا۔ ماں جی نے بتایا کہ ان کو ماموں جان کے آنے کی خبر منڈیر

پر مسلسل بولتے رہنے والے کوّے سے ملی تھی۔ میں بہت حیران ہوا کہ کوّے کو کیسے پتہ چلا کہ میرے ماموں جان آنے والے ہیں لیکن پھر سوچا تو بات سمجھ میں آگئی۔ ماموں جان کی گھوڑی تو راجباہ والے لمبے راستے سے چکر لگا کر آئی تھی اور وہ کھیتوں، درختوں اور تالابوں کے اوپر سے اُڑتا ہوا بہت پہلے پہنچ گیا اور اس نے آکر اپنی بولی میں اطلاع دے دی کہ کھانے کا انتظام کرلیں مہمان آنے والا ہے مجھے اس کوّے پر بہت پیار آیا اور میں اُسے تلاش کرنے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اگلی صبح اپنا انعام لینے ضرور آئے گا۔ اس لئے میں جلدی جاگا۔ دیکھا تو وہ سچ مچ منڈیر پر بیٹھا کائیں کائیں کر رہا تھا۔

ماں جی دودھ بلو رہی تھیں۔ میں نے روٹی کا ٹکڑا تلاش کیا اور مکھن سے چپڑ کر اس کی طرف پھینکا جسے اس نے راستے ہی سے اُچک لیا اور میری اس کی دوستی پکّی ہوگئی۔

میں گاؤں کے سکول سے پڑھ کر شہر چلا گیا تو وہ بھی وہاں آگیا۔ بورڈنگ ہاؤس کے شیشم کے درخت پر بیٹھا رہتا۔ میں کھانا کھانے لگتا تو اڑ کر قریب آجاتا۔ جب کبھی میں گاؤں جاتا وہ مجھ سے پہلے پہنچ کر ماں جی کو میرے آنے کی خبر کر دیتا۔ ماں جی اُسے چُوری کھلاتیں۔ دل زیادہ اُداس ہوتا تو دُودھ ملائی سے اس کی تواضع کرتیں۔

پھر میں گاؤں سے اور دُور بڑے شہر میں چلا گیا۔ پہلے کالج اور پھر یونیورسٹی میں داخلہ لیا — مگر اس نے کبھی میرا ساتھ نہ چھوڑا۔ میں کلاس سے باہر آتا تو وہ کسی کھڑکی کے چھجے یا درخت پر بیٹھا ہوتا کیفے ٹیریا کی منڈیر پر بیٹھا میری طرف دیکھتا رہتا۔ میں اپنے ساتھی لڑکوں لڑکیوں کے ساتھ چائے پیتے ہوئے اس کے لئے ایک آدھ بسکٹ یا سینڈوچ کا ٹکڑا چھپا لاتا۔ میرا جی چاہتا وہ میرے کندھوں پر آبیٹھے۔ میرے ساتھ باتیں کرے۔ میں جس جگہ بیٹھ کر کھانا کھاؤں یا چائے پیؤں وہ میرے ساتھ میز پر بیٹھے اور میرے کھانے کی پلیٹ سے چونچ بھر بھر کر کھائے۔ ماں کو میرے خط اور مجھے ان کے سندیسے پہنچائے۔ مگر وہ ہر وقت بدکتا رہتا۔ اتنی پُرانی اور پکّی دوستی کے باوجود ذرا سا اعتبار نہ کرتا۔ میں آگے بڑھتا تو وہ پھُر سے کسی اونچی ڈال پر جا بیٹھتا۔

پوہ مانگھ کی راتوں میں جب سخت سردی پڑتی، ہیٹر کے قریب بیٹھ کر پڑھتے ہوئے یا گرم ریشمی رضائی میں لیٹے لیٹے مجھے اس کا خیال آجاتا تو مَیں پریشان ہو جاتا۔ پتہ نہیں وہ کہاں کسی درخت کے پتّوں میں چھپ کر بیٹھا سردی سے کانپتا ہوگا۔ بار بار پروں میں سے چونچ نکال کر اس طرف کو دیکھتا ہوگا۔ جدھر سے سورج نکلتا ہے۔

جب کبھی رات کو بارش ہوتی مجھے بار بار اس کا خیال آتا۔ پتہ نہیں وہ کس حال میں ہو۔ میرے بس میں ہوتا تو مَیں اپنے کمرے میں اس کا فوم کا گھونسلہ بنوا دیتا۔ مَیں نے بارش اور جاڑے کی اتنی راتیں اس کی فکر میں گزاریں کہ بعض اوقات مجھے لگتا۔ مَیں نے ایسی ہر رات خود اس کے ساتھ کسی درخت کی ٹہنی پر بیٹھ کر گزاری ہے۔

ایک مرتبہ جب مَیں گرمیوں کی چھٹیوں میں گاؤں آیا ہوا تھا اس نے کمال کر دیا۔ صبح ہوتے ہی بولنے لگ گیا۔ مَیں دو ایک روز پہلے ہی باری باری سب رشتہ داروں سے مل کر لوٹا تھا اور کسی مہمان کے آنے کی توقع تھی نہ انتظار۔ لیکن ماں جی کہنے لگیں۔

"کوا یوں ہی نہیں بول رہا ضرور کوئی آنے والا ہے۔"

مَیں نے کہا۔

"کون آئے گا ماں جی۔ یہ بھوکا ہے اس لئے یونہی ہیلیاں مار رہا ہے۔"

لیکن شام کو جب ہمارے گھر کے سامنے تانگہ آکر رُکا تو مَیں ششدر رہ گیا۔ یوں لگا جیسے کوئی خوشیوں سے بھرا ریڑھا ہمارے دروازے پر اُلٹ گیا ہو۔ تانگے میں سے ناہید اور اس کے ڈیڈی اُترے اور میرے اندر کا بچہ خوشی سے قلقاریاں مارنے اور تالیاں بجانے لگا۔ میرا جی چاہا، کسی بڑے آرکیٹکٹ سے ڈیزائن کروا کر گاؤں کے ہر درخت پر اس کا خوبصورت گھونسلہ بنوا دوں۔ اگلے روز مَیں نے ناہید سے اس کا ذکر کیا تو وہ زور زور سے ہنسنے لگی۔

مَیں جس کسی سے اس کا ذکر کرتا وہ ہنس دیتا۔ آخر مَیں نے اس کا ذکر کرنا چھوڑ دیا۔ مگر اس کے ساتھ میری دوستی اور پختہ ہو گئی۔ مَیں اس کی خاطریں کرتا اور وہ میرے مہمانوں کی خبریں لاتا لے

جاتا رہا۔

پھر میں نے شہر میں ملازمت کر لی۔

ناہید سے میری شادی ہو گئی۔

ماں ایک عرصہ تک اُسے چوری کھلاتی رہیں پھر ان کی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں۔

میرے بالوں کا رنگ سفید ہو گیا۔

بچے بڑے ہو گئے۔

مگر میری اس کی دوستی میں کوئی فرق نہ آیا۔

ہم نے شہر میں بنگلہ بنوایا تو اس نے بھی عقبی باغ میں ٹھکانہ تلاش کر لیا۔ سارا دن گھر کی دیواروں، منڈیروں اور درختوں پر کائیں کائیں کرتا رہتا۔ میں کئی مرتبہ اُسے بھول جاتا مگر اس نے کبھی ہمارا گھر نہ چھوڑا۔ کبھی کبھی چھٹی کے دن میں اس کے لئے کھانے پینے کی چیزیں لے کر باغ میں آجاتا۔ وہ اپنے ساتھیوں کو بھی بلا لیتا۔ سب مل کر شور مچاتے۔ بڑا ہنگامہ رہتا۔ بہت مزہ آتا۔

بچے اور بڑے ہو گئے۔

میں ملازمت سے ریٹائر ہو گیا۔

ناہید ہمیشہ کے لئے میرا ساتھ چھوڑ گئی۔

بہت کچھ اوپر نیچے ہو گیا مگر اس نے دوستی نہ توڑی۔ جب کسی پرانے رفیق یا عزیز رشتہ دار کو آنا ہوتا وہ گھر کے کسی درخت یا منڈیر پر بیٹھ کر دیر تک اونچی آواز میں بولتا رہتا۔

پھر بیٹیاں اپنے گھروں والی ہو گئیں۔

بیٹیوں کے نصیب جاگے اور معصوم قلقاریوں سے گھر بھر گیا۔

میں ہر روز صبح سویرے باغ میں سیر کے لئے جاتا۔

وہ مجھے دیکھ کر خوشی سے سارے باغ میں اڑانیں لیتا۔ گھر آتا تو وہ مجھ سے پہلے آکر منڈیر پر بیٹھا ہوتا۔

پچھلے کچھ مہینوں سے میرے بیٹوں اور بہوؤں کو بنگلہ چھوٹا معلوم ہونے لگا ہے اور انہیں گاؤں والی زمین اور مکانوں کی فکر ستانے لگی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ مجھے گاؤں جا کر اپنے آبائی مکان کو آباد اور زمینوں کی نگرانی کرنی چاہیئے۔ وہ مختلف طریقوں اور حیلوں بہانوں سے مجھے آمادہ کرنے کی کوشش کر چکے ہیں۔ میں نے کئی مرتبہ سوچا کہ چلا جاؤں مگر اپنے میں، بچوں کی رونق چھوڑ کر گاؤں میں تنہا رہنے کا حوصلہ نہ پاتا۔ اور کوئی فیصلہ نہ کر سکتا۔ مگر پرسوں رات جو طوفان آیا تھا۔ اس نے میرا ارادہ تبدیل کر دیا ہے۔ یہ نہایت سخت طوفان تھا۔ میری غلطی سے طوفان کی سمت کی کھڑکیاں کھلی رہ گئی تھیں۔ جن کے رستے باہر کا طوفان گھر کے اندر گھس آیا اور گھر کی بہت سی چھوٹی بڑی چیزیں طوفان کی نذر ہو گئیں۔ نصف رات تک طوفان کے جھکڑ چلتے رہے جس میں میری چھوٹی بہو اور بڑے بیٹے کی بلند آوازوں کا شور بھی شامل تھا۔ باقی کی نصف رات میں نے گذشتہ کوتاہیوں کا شمار کرنے اور طوفان میں بہہ جانے والی چیزوں کا حساب کرنے میں گزاری۔ مجھے بار بار اس کا خیال آتا۔ ایسے شدید جھکڑوں اور خوفناک آوازوں کے طوفان میں پتہ نہیں اس کا کیا حال ہوگا۔ خدا خدا کر کے صبح ہوئی اور میں اس کی خیریت جاننے کے لئے باغ میں گیا۔ وہاں، چاروں طرف بے شمار کوّے کائیں کائیں کرتے پھرتے تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر دیکھا اور پریشان ہو گیا۔ ایک کوّا گذشتہ رات کے طوفان سے مرا پڑا تھا۔ میں نے اُسے پہچان لیا۔ وہ وہی کوّا تھا۔ میرا بچپن کا ساتھی۔ میرے ننھیال اور ماں جی کے میکے سے سندیسے لانے والا۔ میرے رفیقوں اور پیاروں کی آمد کی خبر دینے والا۔ ماں جی کی سُنائی ہوئی چڑیا اور کوّے کی کہانی والا کاگ!

اس سے پہلے میرا ارادہ نہیں تھا۔ لیکن اب اس واقعہ کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ چلا ہی جاؤں۔ وہاں اگرچہ وہ میرے ساتھ نہیں ہوگا۔ لیکن اس کی یاد میرے ہمراہ ہوگی مجھے یقین ہے کہ وہاں اب بھی بڑی بہنیں اپنے ویروں، مائیں اپنے جگر گوشوں اور بڑی بوڑھیاں اپنے پوتوں اور نواسوں کو سونے سے پہلے اس کی کہانی ضرور سناتی ہوں گی اور وہ صبح اُٹھ کر اپنے اپنے کاگ کو منڈیروں پر بولتے اور کلول کرتے دیکھ کر خوش ہوتے ہوں گے۔

دامِ شنیدن

انہیں شک ہے کہ میں نے اپنا عقیدہ بدل لیا ہے۔ حالانکہ ایسا بالکل نہیں ہے۔ میں نے صرف گوشت خوری ترک کی ہے۔

دنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو گوشت نہیں کھاتے یعنی ویجی ٹیرین ہیں ان کے پاس گوشت نہ کھانے کی اپنی اپنی وجوہات ہوں گی ہوسکتا ہے بعض لوگ کسی عقیدے کی بنا پر گوشت نہ کھاتے ہوں۔ بعض کو ڈاکٹر نے پرہیز بتایا ہو کچھ ایسے بھی ہوں گے۔ جن کا نفسیاتی مسئلہ ہوگا مثلاً میں ایک ایسے شخص کو جانتا ہوں۔ جس کا بچپن میں ایک بار زکام بگڑ گیا تھا اور اسے ہر چیز سے مردار کی بو آتی تھی۔ ایسے میں اسے گوشت کی یخنی پلائی گئی تو اسے قے ہوگئی۔ کیوں کہ اسے اس میں سے مردار کی بو آئی۔ حالانکہ یہ بو اس کے اپنے اندر پیدا ہوگئی تھی۔ مگر اس کا دل اس روز سے ہمیشہ کے لئے گوشت سے پھر گیا۔ لیکن میرا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ میں بچپن سے اب تک گوشت خوری کا شوقین رہا ہوں اور بھنا ہوا گوشت تو میری محبوب ترین غذا رہا ہے اور حالانکہ خون میں یورک ایسڈ کی مقدار زیادہ ہوجانے کی وجہ سے مجھے کئی بار ڈاکٹروں نے اس سے پرہیز بتایا۔ اور اس کے نتائج سے آگاہ کیا۔ مگر میں ان کی ہدایات پر کبھی پوری طرح عمل نہ کر سکا۔ مگر اب میں نے کچھ عرصہ سے گوشت خوری بالکل ترک کر دی ہے۔ تاہم اس کی وجہ عقیدے کی تبدیلی نہیں ہے۔ بلکہ اس کا عقیدے سے دور کا بھی

تعلق نہیں ہے۔ میں عام طور پر اس کا ذکر اس لئے نہیں کرتا کہ شاید کسی کو یقین نہ آئے۔ لیکن اب میرا خیال ہے۔ کہ مجھے اصل بات بتا ہی دینی چاہیئے۔ تاکہ میرے بارے میں کسی قسم کی غلط فہمی پیدا نہ ہو۔

مجھے بچپن ہی سے مختلف زبانیں سیکھنے کا شوق تھا۔ اور میں نے چند ایک زبانیں سیکھیں بھی۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ میرا جانوروں اور وہ بھی بھیڑ بکریاں کی زبان سیکھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اسے بس اتفاق اور میری بدقسمتی ہی سمجھئے کہ میں یہ زبان بلا ارادہ سیکھ گیا۔ ہوا یوں کہ ایک زمانے میں ہم گاؤں میں رہتے تھے۔ جہاں ہمارا گھر تھا وہاں پچھواڑے میں بھیڑ بکریوں کا ایک باڑہ تھا میں رات کو دیر تک سکول کا کام کرتا اور جاگتا رہتا اور بھیڑ بکریوں اور ان کے میمنوں کی آوازیں سنتا رہتا۔ دو ایک بار اندھیری رات میں بھیڑیا باڑے میں گھس آیا اور ایک آدھ بھیڑ اٹھا کر لے گیا۔ جس کے بعد بھیڑ بکریاں اور میمنے ہر وقت ڈرے ڈرے اور سہمے سہمے رہنے لگے۔ خصوصاً گرمیوں کی تاریک راتوں میں بھیڑیوں کے خوف سے بھیڑ بکریاں رات رات بھر ممیاتی رہتیں۔ میں لیمپ بجھا کر سونے کی کوشش کرتا مگر ان کی آوازیں اور سرگوشیاں مجھے سونے نہ دیتیں پھر پتہ نہیں کیسے خود بخود ان کی زبان میری سمجھ میں آنے لگ گئی۔ رات بھر میمنے اس قسم کی باتیں کرتے رہتے۔

"ماں مجھے ڈر لگ رہا ہے"

"ماں مجھے بھوک لگ رہی ہے"

"ماں دن کب نکلے گا"

"ہائے مجھے سردی لگ رہی ہے"

اور ہر ماں کی طرح ان کی مائیں بھی انہیں جھوٹی سچی تسلیاں دیتی رہتیں۔

ایک دفعہ ابا کو پتہ نہیں کیا بیماری لگ گئی۔ حکیم صاحب نے انہیں گولیاں دیں اور ہدایت کی کہ وہ ان کو بکری کے دودھ کے ساتھ ایک عرصہ تک استعمال کریں۔ کچھ

روز تو ابا پڑوس والوں سے دودھ مانگتے رہے پھر انہوں نے دودھ دینے والی ایک بکری خرید لی۔ جس کے ساتھ دو ننھے منے گل گتھنے میمنے بھی تھے۔ ایک کالا دوسرا ڈب کھڑبا اس طرح مجھے بکروں کے زیادہ قریب رہ کر ان کی زبان سیکھنے کا موقع مل گیا۔ میمنوں سے میری گہری دوستی ہو گئی۔ میں سکول سے واپس آ کر دیر تک ان سے کھیلتا رہتا انہیں اپنے قاعدے اور کتابوں سے کہانیاں اور نظمیں پڑھ پڑھ کر سناتا۔ شام کو انہیں اپنے ساتھ کھیتوں کھلیانوں میں لے جاتا ان کے لئے درختوں سے ٹہنیاں کاٹتا وہ درختوں کے پتے کھاتے رہتے میں پہاڑے یاد کرتا رہتا، پتے کھاتے، گھاس چرتے اور پہاڑے یاد کرتے ہم آپس میں باتیں بھی کرتے رہتے رات کو وہ اپنی ماں کو دن بھر کی سیر اور کھیل کود کی تفصیل بتاتے اور دوڑنے، چھلانگیں لگانے، کھال اور گڑھے پھلانگنے، بلند ٹیلوں اور جھاڑیوں پر چڑھنے میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی ڈینگیں مارتے۔

"میں بڑا ہو گیا ہوں" ایک کہتا

"نہیں میں اس سے بڑا ہو گیا ہوں" دوسرا کہتا

بکری ان کے ہوشیار اور بڑا ہونے کی باتیں سن کر اداس ہو جاتی۔ اور کہتی

"کاش تم ہمیشہ چھوٹے ہی رہو۔ کبھی بڑے نہ ہو"

ان دونوں کی سمجھ میں بالکل نہ آتا ماں ایسا کیوں سوچتی اور کہتی تھی۔ وہ بُرا منا جاتے۔ اور دیر تک اس سے روٹھے رہتے۔ میں نے بھی انہیں بتانا مناسب نہ سمجھا کہ ان کے بڑے ہونے پر کس قسم کے حالات پیدا ہو سکتے ہیں

پھر ایک دن ڈب کھڑبا گم ہو گیا۔ ہم نے بہت ڈھونڈا۔ مگر اس کا کچھ پتہ نہ چلا۔ بکری کئی روز تک اسے یاد کر کے چلاتی اور ممیاتی رہی اور کالا بھی اسے یاد کرتے رہے پھر آہستہ آہستہ بھول گئے

کالا اب اور بڑا ہو گیا تھا۔ اس کے سینگ بڑے اور نوکیلے ہو گئے تھے اور

اس کے جسم سے بڑے بکروں جیسی بو آنے لگی تھی۔ بڑے بوڑھے اکثر اس کا منہ کھول کر اس کے دانت دیکھتے۔ میرے ہم عمر لڑکے اسے دیکھ کر ڈر جاتے حالانکہ وہ کسی کو کچھ نہیں کہتا تھا۔ میں اسے ساتھ لے کر گھومتا رہتا۔ ہم ایک دوسرے کی زبان ہی نہیں اشارے بھی سمجھتے تھے۔ میں اسے جہاں بلاتا وہ دوڑ کر پہنچ جاتا۔ جس بات سے منع کرتا منع ہو جاتا۔ میں جدھر جاتا وہ میرے پیچھے پیچھے آجاتا مجھے دور سے پہچان لیتا۔ میری خوشبو سے مجھے جان لیتا۔ لیکن ایک روز بڑا دلچسپ واقعہ ہو گیا۔

وہ میرے مغالطے میں شیقو نائی کے پیچھے چل دیا۔ شیقو بے چارہ گھبرا گیا۔ وہ جدھر جاتا جس قدر تیز بھاگتا کالا بھی اس کے پیچھے دوڑتا آتا۔ خوف سے تھر تھر کانپتا شیقو بڑی مشکل سے جان بچا کر گھر پہنچا۔ اس کی ماں شکایت لے کر آئی کہ آپ کے بکرے نے مارنے کے لئے دور تک میرے بیٹے کا پیچھا کیا ہے۔ شیقو کی ماں چلی گئی تو میں نے بکرے سے استفسار کیا اور یہ جان کر میری ہنسی چھوٹ گئی۔ کہ شیقو نے اس روز اسی رنگ کی چادر اوڑھی ہوئی تھی جیسی میری چادر تھی اور کالا یہ سمجھتا رہا کہ وہ میرے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ بکرے نے بھی اس واقعے پر ہنسنا چاہا۔ مگر کوشش کے باوجود نہ ہنس سکا۔ اور دیر تک اس بات پر اداس رہا کہ اسے ہنسنا نہیں آتا تھا۔ لیکن اگلے روز یہ معلوم کر کے کہ اس کی ماں سیم نالے کے پل سے گر کر زخمی ہو گئی تھی اور اسے ذبح کیا جا رہا تھا۔ ہم دونوں سخت پریشان ہو گئے میں اسے دیر تک تسلی دیتا اور اس کا دل بہلانے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن بعد میں جب اسے پتہ چلا کہ میں نے بھی اس کی ماں کا گوشت مزے لے لے کر کھایا ہے تو مجھ سے بدکنے لگا۔ اور کئی روز تک میرے قریب آنے سے ہچکچاتا رہا۔ میں اسے پیار کرنے لگتا تو وہ سمجھتا میں دانتوں سے اس کی بوٹی نوچنے لگا ہوں۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ میں آدمی ہوں بھیڑیا نہیں۔ ہم آدمی زندہ جانوروں کو نہیں کھاتے۔ کھانے سے پہلے انہیں مار لیتے ہیں۔ کچا نہیں چبا جاتے۔ چبانے سے پہلے آگ پر بھون لیتے ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ

کچھ دنوں بعد اس کا خوف کم ہو گیا۔ اور وہ مجھ پر پہلے کی طرح اعتماد کرنے لگا۔

میں نے پرائمری کا امتحان پاس کر لیا اور شہر کے ہائی سکول میں داخلہ لے لیا تو وہ بہت اداس ہو گیا مجھے بھی اس سے بچھڑنے کا بہت افسوس تھا۔ مگر مجبوری تھی۔

بڑی عید کی چھٹیوں میں مَیں خوش خوش گاؤں واپس آیا۔ لیکن یہ جان کر میری ساری خوشی کافور ہو گئی۔ کہ اس بار عید پر اس کی قربانی دی جا رہی ہے۔ میں نے گھر میں ہر ایک کی منت سماجت کی کہ وہ میرے کالے کو چھوڑ دیں اور قربانی کے لئے کوئی دوسرا بکرا یا دنبہ خرید لیں۔ مگر میری ایک نہ چلی کالے کو بالکل پتہ نہیں تھا۔ کہ اس کے ساتھ کیا بیتنے والی ہے۔ میں نے بھی اسے پریشان کرنا مناسب نہ سمجھا وہ خوش خوش میرے ساتھ دوڑتا پھرتا۔ چھلانگیں لگاتا۔ اونچے پیڑوں کے تنوں سے چمٹ کر پتے نوچتا اور میری ٹانگوں سے سینگ رگڑ رگڑ کر اظہار محبت کرتا۔ مگر جب اسے الٹا کر چھری چلاتے تھے۔ اس نے گھبرا کر مجھے آوازیں دینا شروع کر دیں میں اسے ذبح ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس لئے اپنے کمرے میں چھپ گیا تھا۔ مگر اس کی چیخ و پکار مجھے سنائی دے رہی تھی۔ شاید اس کا خیال تھا۔ کہ میں آ کر اسے بچا لوں گا اس لئے آخری وقت تک مجھے پکارتا اور داد فریاد کرتا رہا مگر میں آنسو بہانے کے سوا کچھ نہ کر سکا۔ میرا خیال تھا۔ میں احتجاج کے طور پر کم از کم اس کا گوشت نہیں کھاؤں گا۔ مگر جب گوشت پک کر میرے سامنے آیا تو اس کی خوشبو سونگھ کر میرے منہ میں پانی بھر آیا۔ اور میں نے سب کچھ بھول کر بوٹیاں کھانا شروع کر دیں۔

اس کے بعد میں نے کبھی کسی بکرے یا پالتو جانور سے دوستی نہیں کی۔ ہر بقر عید پر ہمارے ہاں دنبہ یا بکرا آتا رہا اور ذبح ہوتا رہا لیکن میں کوشش کرتا کہ ان سے دوستی یا محبت نہ ہو۔ ورنہ زیادہ افسوس ہوتا ہے۔ حالانکہ ابا کا خیال تھا جانور سے جتنی زیادہ مانوسیت اور محبت ہو اتنا ہی زیادہ ثواب ملتا ہے۔ لیکن میں کوشش کے باوجود خود میں

اتنی ہمت نہ پاتا۔ چنانچہ جب قربانی کا وقت آتا میں عید ملنے کے بہانے رشتہ دار یا دوست کے ہاں چلا جاتا۔ اور اس وقت گھر آتا جب بکرا یا دنبہ کٹ چکا ہوتا۔ ابا کہتے تھے اس سے ایمان کمزور پڑ جاتا ہے۔ لیکن میں ایمان کو کمزور نہیں پڑنے دیتا تھا۔ کٹے ہوئے بکرے یا دنبے کو مزید کاٹنے، بوٹیاں چیرنے اور رشتہ داروں اور درویشوں میں تقسیم کرنے میں ان کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ گھبراہٹ اور کمزوری کا اظہار میں صرف اسی وقت تک کرتا تھا جب تک بکرا یا دنبہ زندہ ہوتا اور دیکھ سن بول اور محسوس کر سکتا۔ ہاں مجھے چھری سے بہت ڈر لگتا۔ میں قصاب کی دکان پر بھی بکرے یا دنبے کی چھری دیکھتا تو اس کی بے جان آنکھوں کا سامنا نہ کر سکتا مجھے ایسا لگتا جیسے وہ مجھ پر گڑی ہوں اور کچھ کہہ رہی ہوں میری یہ کوشش بھی ہوتی کہ میں کسی بکرے کو پتہ نہ چلنے دوں میں اس کی زبان جانتا ہوں میں نے گھر والوں اور جاننے والوں سے بھی اس کا ذکر نہیں کیا کہ میں بکروں کی زبان جانتا ہوں لیکن ان کی زبان جاننے سے خاصی تکلیف دہ صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی بعض اوقات مجھے لگتا میں اندر سے بکرا بنتا جا رہا ہوں۔

گھر والوں نے کئی بار اصرار کیا کہ عید کی قربانی میں خود کروں اپنے ہاتھ سے بکرے کی گردن پر چھری چلاؤں کیوں کہ ایسا کرنا سنت ہے۔ مولوی صاحب نے بھی مجھے سمجھایا اور بتایا کہ ایسا کرنا اس لئے ضروری ہے کہ اللہ کی راہ میں خون بہانے کا جذبہ اور جرأت پیدا ہوتی ہے اور آدمی جہاد میں حصہ لینے کی تربیت پاتا ہے۔ لیکن میں کوشش کے باوجود ایسا نہ کر سکا۔ کیوں کہ ذبح ہونے سے پہلے بکرے جس طرح آہ و بکا کرتے ہیں اسے صرف میں ہی سن اور سمجھ سکتا ہوں اور صرف مجھے ہی اس بات کا اندازہ ہے کہ کسی ہم زبان کو ذبح کرنا کتنا مشکل کام ہے۔ یہ کسی عام آدمی کے بس کی بات نہیں عام آدمی کسی ہم زبان اور ہم جنس کو قتل تو کر سکتا ہے۔ ذبح نہیں کر سکتا۔ اس کے لئے پیغمبر کا دل اور حوصلہ درکار ہوتا ہے۔ انہیں بھی آنکھوں پر پٹی باندھنا پڑتی ہے۔ مجھے اکثر

خیال آتا ہے کہ کاش مجھے بکروں کی زبان نہ آتی ہوتی اور میں اس قدر بزدل نہ ہوتا۔ بہرحال اگرچہ اسے ایمان کی کمزوری پر محمول کیا جاتا تھا۔ مگر میں نے تہیہ کیا ہوا تھا کہ اپنے ہاتھ سے کسی جانور کو ذبح نہیں کروں گا۔ لیکن پچھلے سال میں اپنے اس عہد پر قائم نہ رہ سکا اور یہیں سے غرانی کا آغاز ہوا۔

ہوا یوں کہ بہت سی دعاؤں اور منتوں کے بعد میرے گھر میں اللہ کے فضل وکرم سے بیٹا پیدا ہوگیا۔ بہت خوبصورت اور بالکل مہینے کی طرح پیارا۔ ابا نے فوراً عقیقے کے لئے دو بکرے منگوالئے: شہر میں ایک عرصہ سے رہتے رہتے اب بکروں سے کبھی کبھار ہی ملاقات ہوتی تھی۔ اور گفتگو سے تو میں خود بھی گریز کرتا تھا۔ لیکن عقیقے کے دونوں بکرے کئی روز تک میرے کمرے کی کھڑکی کے قریب صحن میں بندھے رہے خیال تھا کہ جمعرات کو عقیقہ کیا جائے لیکن آپا کو سسرال سے آنے میں دیر ہوگئی۔ شاید ان کا کوئی جیٹھ یا دیور بیمار تھا۔ اس دوران میں دونوں بکرے رات کو جگالی کرتے ہوئے عجیب وغریب گفتگو کرتے رہتے۔ پتہ نہیں انہیں کیسے اپنے انجام کی خبر ہوگئی تھی۔ چھوٹا بہت زیادہ خوفزدہ تھا۔ ایک رات کہنے لگا۔

"ذبح کس طرح کرتے ہیں؟"

"زمین پر لٹا کر چھری چلا دیتے ہیں" بڑے نے کہا

"تکلیف تو بہت ہوتی ہوگی؟"

"ہاں میں نے ایک بار دیکھا تھا بڑی دیر تک جان نکلتی رہتی ہے"

"ذبح کیوں کرتے ہیں؟"

"کھانے کے لئے ان کے منہ میں بھی بھیڑیئے کے دانت ہوتے ہیں"

"میری تو ڈر کے مارے ابھی سے جان نکلنے لگی ہے"

"ڈر تو مجھے بھی لگ رہا ہے"

"کیا دونوں کو ایک ساتھ ذبح کریں گے ؟"

"شاید باری باری"

"پہلے کون ذبح ہوگا؟"

"تمہیں زیادہ ڈر لگتا ہے اس لئے پہلے میں"

"تمہیں ذبح ہوتے دیکھ کر تو میں اور بھی گھبرا جاؤں گا۔ اس لئے پہلے میں"

"نہیں میں"

"نہیں میں"

"میں میں میں"

میں دیر تک ان کی باتیں سنتا رہا پھر اٹھ کر کھڑکی بند کر دی مگر مجھے دیر تک نیند نہ آئی۔

اگلے روز چھٹی کا دن تھا۔ میں دیر سے سو کر اٹھا۔ دیکھا تو گھر میں دوپہر کے کھانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ پیاز چھیلے جا رہے تھے۔ مسالہ پیسا جا رہا تھا۔ تکوں۔ کوفتوں اور بالٹی گوشت کا پروگرام بن رہا تھا۔ والد صاحب شاید قصائی کو بلانے گئے ہوئے تھے۔

کال بیل کی آواز سن کر میں باہر گیا تو پڑوس کی مسجد سے دینی مدرسے کا طالب علم لڑکا کھالوں کے بارے میں پتہ کرنے آیا تھا۔ کہ اتری ہیں یا نہیں۔ میں نے اسے بتایا کہ ابھی نہیں اتری ہیں۔

"ابھی تک نہیں اتریں" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"ذبح کئے بغیر کیسے اتار سکتے ہیں۔"

"ہاں جی —— یہ تو ٹھیک ہے میں پھر آجاؤں گا"

جب ذبح کرنے کا وقت آیا۔ میں گھر سے نکل جانا چاہتا تھا۔ لیکن ابا نے میرے ہاتھ میں چھری تھما دی اور اصرار کیا کہ میں اپنے ہاتھ سے ذبح کروں میں نے بہت کوشش کی مگر انہوں نے مجھے جانے نہ دیا۔

پہلے چھوٹے کو لایا گیا وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اور خوف سے ممیا رہا تھا۔

مجھے بہت ترس آیا۔ میں نے کہا

"پہلے بڑے کو لاؤ"

بڑے کو لایا گیا تو وہ زور زور سے چیخنے لگا پھر گھگھیائی ہوئی آواز میں چھوٹے سے مخاطب ہوا۔

"منہ دوسری طرف کر لو چھوٹے"

چھوٹے کا اپنی جگہ کھڑے کھڑے پیشاب خطا ہو گیا۔

مجھے اسکی رات والی بات یاد آئی۔ میں نے سوچا بڑے کو پہلے ذبح کیا تو وہ ہول سے مر جائے گا۔ چنانچہ میں نے کہا۔

"پہلے چھوٹے ہی کو لاؤ"

اصل میں میں فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ کہ پہلے کسے ذبح کروں۔ وہ چھوٹے کو لے آئے جب اسے لٹایا گیا تو اس نے زور زور سے ممیانا اور چیخنا شروع کر دیا

"ہائے میں مرا — ہائے میں مرا"

"حوصلہ کرو" میرے منہ سے اچانک نکل گیا "تم اللہ کی راہ میں قربان ہو رہے ہو"

بکرے نے چونک کر گردن اٹھائی اور مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو پھر اس نے ایک لمبا سانس لیا اور چھری کے نیچے اپنی گردن کو ڈھیلا چھوڑ دیا

میں نے اللہ اکبر کہہ کر چھری چلا دی اور وہ حلال ہو گیا مگر جب کھانے کا وقت آیا تو مجھے گوشت سے ویسی ہی بو آئی جیسی اپنے نومولود بیٹے سے آتی تھی۔ اور میں نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا

اس کے بعد میں کوشش کے باوجود کبھی گوشت کو چھو نہ سکا اب انہیں شک ہے کہ میں نے اپنا عقیدہ بدل لیا ہے حالانکہ ایسا بالکل نہیں ہے میں نے صرف گوشت خوری ترک کی ہے

دُنیا کا آخری بھوکا آدمی

ایسا ہوتا ہے۔

ایسا ہو جاتا ہے کہ آپ کے پاس کوئی ضرورت مند آیا اور آپ نے سوچے سمجھے بغیر اپنے دفاع کے لیے اندر کے خسیس اور کمینہ خصلت منشی کو پکارنا شروع کر دیا اور جب منشی اور مہمان رخصت ہونے آپ کو یاد آنے لگا کہ ضرورت مند شخص سے آپ کے کتنے دیرینہ یا گہرے تعلقات تھے۔ آپ پر اس کے کتنے احسانات تھے یا اس کی ضرورت کتنی جائز اور اہم تھی۔ اَب آپ چاہتے ہیں اس کی تلافی ہو جائے مگر نہیں ہو پاتی کہ اس نے کسی اور ذریعے سے اپنی مشکل پر قابو پا لیا ہے اور آپ اَب کفِ افسوس ملنے کے لیے رہ گئے ہیں۔

بس کچھ ایسا ہی ہوا۔

ہم ایک پُرتکلف دعوت سے لوٹ رہے تھے، رات کے نو سوا نو بج رہے تھے۔ بازار میں زیادہ تر دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ مگر بیکریوں، پان سگریٹ کے کھوکھوں، کھانے پینے کے اسٹالوں اور اوپن ایر ریستورانوں پر ابھی تک رونق تھی۔ مچھے جمائیاں آ رہی تھیں مگر وہ ابھی تک تر و تازہ تھی۔ کیونکہ اس نے خوبصورت لباس اور قیمتی زیور پہن رکھا تھا۔

گنجائش تو نہیں تھی لیکن آج کل شہر کے اس فیشن ایبل علاقے میں رات کو کاروں میں بیٹھ کر کھانا پینا کھاتے پیتے لوگوں کا دستور ہے۔ خود کو اس طبقے میں شامل سمجھنے کے لیے ہمیں بھی یہ دستور نبھانا پڑتا ہے۔ میں نے اس کے لیے آئس کریم اور اپنے لیے کولڈ ڈرنک

منگایا۔ اَب صرف پان کی گنجائش رہ گئی تھی۔ میں منگا بھی سکتا تھا مگر سوچا اسی بہانے ٹہل لوں گا۔ بیٹھے بیٹھے پیٹ میں ہوا بھر گئی تھی۔ مَیں پان لے کر لوٹا تو وہ تنکوں کی تین ٹوکریاں اُٹھائے اس کے قریب کھڑا تھا۔ وہ منع کر رہی تھی اور وہ اصرار ـــــ مَیں نے کوئی دخل نہ دیا۔ ہوٹل کے لڑکے کو ٹپ دی اور گاڑی سٹارٹ کرنے لگا۔ وہ بولی۔

"اسے کچھ دے دیں کہہ رہا ہے بھوکا ہوں۔"

"کوئی بھوکا وُوکا نہیں ہوتا۔" مَیں نے ریورس گیئر لگایا۔ "سب مانگنے کے بہانے ہیں۔"

گاڑی ریورس ہوئی۔ وہ پریشان ہو کر بولی۔

"وہ رو رہا ہے۔"

کون کہاں رو رہا ہے؟"

مَیں نے ایک نظر اُسے دیکھا۔ وہ ٹوکریاں زمین پر رکھے ننھے بچّوں کی طرح روتے ہوئے اپنے آنسو پونچھ رہا تھا۔

"بڑے مکّار ہوتے ہیں یہ ـــــ فریبی۔"

مَیں نے یہ الفاظ نسبتاً بلند آواز مگر کھوکھلے لہجے میں کہے کیونکہ مَیں خود کو ڈھارس دینا چاہتا تھا۔ ورنہ سچی بات یہ ہے کہ بچپن ساٹھ برس کے ایک بزرگ صورت شخص کو اس طرح بلکتے دیکھ کر میرے اندر بہت کچھ آپ ہی آپ ٹوٹ گیا تھا۔ میں اسے کچھ دے سکتا تھا۔ دینا چاہتا تھا لیکن اب گاڑی سڑک پر آچکی تھی آگے پیچھے بھاری ٹریفک تھا۔ پھر وہ کیا سوچتی مَیں اندر سے اتنا کمزور اور زود پشیمان ہوں؟ لیکن گھر پہنچتے پہنچتے مجھے لگا زار و قطار روتا وہ بوڑھا ذہن سے چپک کر میرے ساتھ ہی چلا آیا ہے۔

مَیں نے کپڑے تبدیل کیے اور ٹیلی ویژن کھولا مگر بند کر دیا۔ کتاب لے کر لیٹا مگر پڑھنے میں جی نہ لگا۔ بار بار بوڑھے کا آنسوؤں سے تر چہرہ نگاہوں میں گھوم جاتا۔ کاش میں

نے اسے روپیہ دو روپیہ دے دیا ہوتا۔ یہ اُلجھن تو نہ ہوتی۔

روپیہ —— جس کا مَیں نے پان چبا کر تھُوک دیا تھا جسے مَیں سگریٹ کی صورت پھونک رہا تھا۔ جس کی قیمت کا سوڈا واٹر میں بوتل میں چھوڑ آیا تھا اور روپیہ —— جو میں نے ہوٹل کے لڑکے کو ٹپ میں دے دیا تھا۔

کبھی خود پر غصہ آتا کبھی بوڑھے پر —— طرح طرح سے جی کو بہلانے کی کوشش کی کہ ضرور اس کا تعلق پیشہ ور بھکاریوں کے کسی گروہ سے ہوگا اور اب تک اس کی اپنی گاڑی اسے لینے آگئی ہوگی بلکہ اب تک وہ اپنے ڈیرے پر پہنچ کر دن بھر کی کمائی کا حساب لے یا دے رہا ہوگا۔ کیا پتہ وہ اس وقت کسی ریستوران میں بیٹھ کر چکن تکہ یا کڑاہی گوشت کھا رہا ہو یا چرس بھرے سگرٹوں کے کش لگا رہا ہو لیکن دوسرے ہی لمحے آنسوؤں سے دُھلا ہوا اس کا معصوم اور نڈھال چہرہ نگاہوں میں گھوم جاتا اور مَیں پریشان ہو جاتا۔

پریشانی سے بچنے کی صرف ایک صورت تھی کہ مَیں واپس جاؤں اور اگر وہ بھوکا ہے تو اسے کھانے کے لیے کچھ پیسے دے آؤں یا اگر وہ کڑاہی گوشت کھا، یا سگریٹ پھونک رہا ہے تو اس پر نفرین بھیج کر واپس آجاؤں اور مطمئن ہو کر سو جاؤں۔ لیکن میں اپنی ہر کمزوری اس سے چھپاتا رہا۔ اس لیے میں نے کسی ضروری کام کا بہانہ کیا اور گیراج سے گاڑی نکال کر بازار کی طرف روانہ ہو گیا۔

جونہی میں گلی کا موڑ مڑ کر سڑک پر آیا مجھے دُور پہاڑوں میں واقع اس کا چھوٹا سا گھر دکھائی دینے لگا۔ جہاں اس کی بیمار بیوی کھاٹ پر لیٹی کھانس رہی تھی اور زرد رو بیٹی بیٹھی تنکوں کی ٹوکری بنا رہی تھی۔ اس کی بیٹی کو اپنے کام میں بڑی مہارت ہے اور اُسے اپنی بنائی ہوئی ٹوکریوں پر بڑا ناز ہے مگر اسے شکایت ہے کہ قصبے کا دکاندار اچھے دام نہیں دیتا وہ ہر بار بابا سے کہتی ہے کہ وہ ٹوکریاں شہر لے جا کر بیچے اور دیکھے کہ بیگمات ان کی کتنی قدر کرتی ہیں۔ پھر میں نے دیکھا کہ بل کھاتی پہاڑی سڑک پر وہ شہر کو

جاتی بسوں کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتا ٹوکریاں اُٹھائے پیدل چل رہا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ شہر میں داخل ہوتے ہی جگہ جگہ بیگمات کاریں روک کر ٹوکریاں دیکھنے کے لیے رُک جائیں گی اور ہاتھوں ہاتھ خرید لیں گی۔ پھر وہ بیوی کی دوائی، بیٹی کے کپڑے اور بکری کی گانی خرید کر بس پر سوار ہوگا اور اپنے گھر واپس چلا جائے گا۔ مگر آج تیسرا روز ہے اور اس کی ایک بھی ٹوکری فروخت نہیں ہوئی شاید ان کا فیشن ختم ہوگیا ہے یا ڈیزائن پرانے ہوگئے ہیں وہ سڑکوں اور بازاروں میں ٹوکریاں اُٹھائے بھوکا پیاسا مارا مارا پھرتا ہے۔

میں نے بازار کے اس حصّے میں جہاں تھوڑی دیر پہلے اسے روتا چھوڑ گیا تھا پہنچ کر گاڑی روکی۔ اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ میرا خیال تھا وہ یہیں کہیں آتی جاتی کاروں کے گرد منڈلاتا ہوگا۔ لیکن وہ کہیں دکھائی نہ دیا۔ میرے دل کو دھچکا سا لگا۔ میری پشیمانی کیسے دُور ہوگی۔

میں نے بازار میں گھوم پھر کر اسے تلاش کرنا شروع کر دیا۔ لیکن وہ کہیں نظر نہ آیا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ ضرور وہ چھپ کر کسی ریستوران میں کھا پی رہا ہوگا۔ اگر میں اُسے کھاتے پیتے دیکھ لوں تو مجھے کس قدر سکون ملے۔ دل میں چبھی ہوئی پھانس سی نکل جائے۔

ہوٹلوں اور ریستورانوں میں طرح طرح کے لوگ بیٹھے کھا پی رہے تھے۔ گپ شپ کر رہے تھے۔ میرے ذہن میں اس کی شکل نہیں تھی لیکن اتنا یاد تھا کہ اس کے چہرے پر چھوٹی چھوٹی سفید داڑھی تھی اور وہ پچپن ساٹھ برس کا ایک دیہاتی بوڑھا تھا۔ جس کے پاس تین ٹوکریاں تھیں۔ میں نے ایک ہوٹل میں جا کر اسے تلاش کیا۔ لیکن وہ کہیں نہ ملا۔ کئی بار ارادہ کیا کہ لوٹ جاؤں مگر مجھے اپنی طبیعت کا حال معلوم تھا۔ ذرا سی اُلجھن بھی ہو تو جب تک اس پر قابو نہ پالوں یا اس کا حل نہ سوچ لوں چین نہیں آتا۔ میں نے اُسے فٹ پاتھوں اور ملحقہ پارکوں میں سوئے یا سوتے جاگتے آدمیوں میں بھی تلاش کیا۔ پھر قریبی مسجدوں میں جا کر دیکھا۔ رات کے بارہ بج گئے مگر اس کا کہیں دور دور تک پتہ نہ تھا۔ اب اس

کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ ناکام واپس آؤں اور رات بھر بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہوں۔

تو کیا وہ سچ مچ بھوکا تھا۔ بغیر کچھ کھائے پیئے سو گیا۔ سویا کہاں ہوگا۔ خالی پیٹ نیند کہاں آتی ہے۔ بھرے پُرے شہر میں بھوکا رہ کر وہ کیا سوچتا ہوگا۔ یہ کتنی عجیب بات ہے۔ کہ لذیذ کیک پیسٹریوں سے بھری بیکریوں، خوش ذائقہ مٹھائیوں سے اٹی مٹھائی کی دکانوں، اناج سے بھرے گوداموں اور خوش رنگ پھلوں سے آراستہ فروٹ شاپس کے سامنے یا کہیں آس پاس آدمی بھوکا پڑا ہو۔

رات بھر عجیب واہیات اور مکروہ خواب دکھائی دیتے رہے۔ کبھی میں دیکھتا، میں جس شخص کی برائیاں بیان کر رہا ہوں وہ عین میرے پیچھے کھڑا سن رہا ہے۔ کبھی دیکھتا کہ میں نے ایک بچّے سے ٹافی چھین کر ہڑپ کر لی ہے اور وہ میرے سامنے زار و قطار رو رہا ہے۔ بار بار آنکھ کھلتی رہی۔ عجیب ندامت بھری رات تھی۔

صبح دفتر جاتے ہوئے میں نے بازار کا ایک لمبا چکّر لگایا۔ فٹ پاتھوں، دکانوں کے تھڑوں اور ملحقہ پارکوں پر نظر دوڑائی۔ دفتر میں بھی بار بار مجھے اس کا خیال آتا رہا۔ دفتر سے واپسی پر بھی میں نے بازار کا اس خیال سے چکّر لگایا کہ شاید وہ کہیں دکھائی دے جائے۔ اور میں اُسے روپیہ دو روپیہ دے کر اس خلش سے نجات حاصل کر سکوں جو مجھے گذشتہ شب سے اندر ہی اندر بے چین کر رہی تھی۔ لیکن وہ کہیں بھی نظر نہ آیا۔ تاہم مجھے توقع تھی۔ کہ شام کے بعد وہ ضرور اسی جگہ مل جائے گا جہاں اس سے ملاقات ہوئی تھی۔

مَیں نے شام ہونے کا بیتابی سے انتظار کیا اور کھانا کھائے بغیر ٹہلنے کے بہانے بازار کی طرف چل دیا۔ مَیں بڑی دیر تک اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد گذشتہ رات والی جگہ کا چکّر لگاتا مگر وہ نہ ملا۔ مجھے اس پر غصّہ آنے لگا۔

بدبخت تیری اتنی عمر گزر گئی لیکن تجھے خبر نہ ہوئی کہ دُنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ آخر تو اتنا عرصہ کرتا کیا رہا ہے؟ کہ اس زمانے میں بھی بھوکا سوتا ہے۔ جب اس موضوع پر شاعر

نظمیں کہنا اور افسانہ نگار کہانیاں لکھنا ترک کر چکے ہیں۔ تیری زندگی میں کتنے ملک آزاد ہوئے کتنی نئی قومیں اور ملک معرضِ وجود میں آئے۔ کیا کیا ایجادات ہوئیں۔ کتنے علمی اور سائنسی انکشافات ہوئے۔ ٹیکنالوجی نے انقلاب برپا کیا۔ کلرک وزیر سفیر اور سپاہی جرنیل کرنیل بن گئے۔ دینو میراثی کا لڑکا پٹواری بن گیا ـــــ رحموں نائی کا بیٹا کلاس ون افسر لگ گیا۔ وسیم خان راج گیری کرتا تھا اب اے کیٹیگری گورنمنٹ کنٹریکٹر ہے۔ جمیل صاحب پروف ریڈنگ کرتے تھے۔ اب پرنٹنگ پریس کے مالک ہیں ـــــ بشیرا ریڑھی لگاتا تھا اب ہول سیل فروٹ مرچنٹ ہے۔

بدبخت بوڑھے صرف تو رہ گیا ـــــ اتنی تبدیلیاں آئیں اور تجھے خبر ہی نہ ہوئی۔ ٹھیکے، پرمٹ، لائسنس، نیلام، الاٹمنٹیں، وظیفے ـــــ پتہ نہیں تو کس کھوہ میں چھپا رہ گیا۔ تُو نے اپنے پہاڑوں سے اُتر کر کبھی دیکھا ہی نہیں ـــــ تُو نے دھوپ میں بال سفید کیے۔ ساری دُنیا آگے نکل گئی صرف تم پیچھے رہ گئے۔ میرا سکون غارت کرنے کے لیے ـــــ لیکن تم اگر بھوک سے مرتے ہو تو مرو۔ میری بلا سے۔ میری کیا ذمہ داری ہے اور کیا مجھ اکیلے کی ذمہ داری ہے۔

مَیں نے اُسے اگلے روز اس سے اگلے روز بھی تلاش کیا۔ یقیناً وہ اپنے گھر واپس چلا گیا ہو گا۔ یہ سوچ کر مَیں دل کو تسلّی دینا چاہتا۔ لیکن ایک بوجھ سا تھا جو میں ہر وقت دل پر لیے پھرتا تھا۔ ایک بے چینی سی تھی۔ ایک خلش تھی جو مجھے بے چین کرتی رہتی تھی۔

پھر ایک روز میں نے اخبار میں ایک خبر پڑھی۔ ایک نامعلوم بوڑھا بس کے نیچے آ کر کچلا گیا تھا اور حالانکہ خبر میں ٹوکریوں کا ذکر نہیں تھا لیکن میں نے یہ یقین کر لینے میں عافیت سمجھی کہ وہ وہی بوڑھا تھا۔ مجھے دُکھ ضرور ہوا۔ لیکن اس رات میں چین اور سکون کی نیند سویا جیسے آخری ہمجو کا آدمی دُنیا سے اُٹھ گیا ہو۔

غروب ہوتی صبح

عجیب دروغ بھری صبح طلوع ہوئی ہے کہ پتہ ہی نہیں چل رہا وہ جاگ گیا ہے یا ابھی تک سو رہا ہے۔ اگر وہ سو رہا ہے تو سامنے والی خالی کھڑکی اسے کیسے نظر آ رہی ہے اور اگر وہ جاگ رہا ہے تو اسے اپنے خراٹوں کی آواز کیسے سنائی دے رہی ہے۔ ان خراٹوں کے ساتھ ساتھ اسے ان شارکوں کا شور بھی سنائی دے رہا ہے۔ جو اسے نظر تو نہیں آ رہیں مگر خالی کھڑکی کے چھجے پر بیٹھی عجیب و غریب آوازیں نکال کر آپس میں اظہار محبت کر رہی ہیں یا شاید لڑ جھگڑ رہی ہیں۔ اچانک اس کا پاؤں پھسل جاتا ہے اور وہ گہرے پانی میں غوطے کھانے لگتا ہے۔ عجیب کیفیت ہے، وہ سوچتا ہے کہ وہ ڈوب بھی رہا ہے اور خود کو ڈوبتے ہوئے دیکھ بھی رہا ہے۔ اس کا مطلب ہے۔ وہ ڈوب گیا تب بھی کچھ نہ کچھ بچ جائے گا۔ اسی لمحے آپس میں لڑتی جھگڑتی یا شاید چہلیں کرتی شارکوں میں سے ایک ایسی عجیب و غریب آواز نکالتی ہے جیسے ہنس رہی ہو۔ دوسری آہستہ سے کچھ کہتی ہے۔ پھر پہلی زور زور سے چلاتی ہے۔

"جھوٹ، جھوٹ، جھوٹ"

اس کے بعد دونوں میں سے کوئی جیسی بھی آواز نکالتی اور کچھ بھی کہتی ہے، دوسری زور زور سے چلانے لگتی ہے "جھوٹ، جھوٹ، جھوٹ"

شاید اب اس کا ذہن کچھ کچھ بیدار ہو گیا ہے کہ خراٹوں کی آواز سنائی نہیں دے رہی اسے یاد آتا ہے رات وہ دیر تک اپنے پسندیدہ گیتوں کا کیسٹ لگا کر سنتا رہا ہے، پڑوس سے نامانوس آوازوں کا شور سنائی دیتا ہے۔ وہ ہاتھ بڑھا کر ٹیپ ریکارڈ کا بٹن دباتا ہے مگر جونہی گیت ختم ہوتا ہے شارک کی آواز سنائی دیتی ہے۔

"جھوٹ۔ جھوٹ۔ جھوٹ"

اس کے بعد وہ جو بھی گیت سنتا ہے۔ دونوں شارکیں یا ان میں سے کوئی ایک جھوٹ جھوٹ کی گردان کرنے لگتی ہے۔

وہ ٹیپ ریکارڈ بند کر دیتا ہے اور ریڈیو سے خبریں سنتا ہے۔ شارکیں اب بھی باز نہیں آتیں۔ وہ لیٹے لیٹے پاؤں کی ٹھوکر سے کھڑکی کا پٹ بند کر دیتا ہے پٹ کے زور سے بند ہونے کی آواز سن کر شارکیں اڑ جاتی ہیں۔ اب ہنسنے کی اس کی باری ہے۔

تکیے کے نیچے سے ہاتھ ڈال کر سگریٹ کا پیکٹ نکالتا ہے۔ سگریٹ منہ میں لے کر سلگانے لگتا ہے۔ مگر پھر اسے یاد آتا ہے کہ آج چھٹی کا دن ہے اور باوجی ابھی تک گھر پر ہوں گے۔ سگریٹ کی خوشبو سے انہیں فوراً پتہ چل جائیگا کہ اس نے سموکنگ پھر سے شروع کر دی ہے۔ کیا مصیبت ہے وہ جھنجھلا کر سوچتا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے سگریٹ بھی نہیں پی سکتا۔ گردن کے پیچھے دونوں ہاتھ باندھ کر لیٹ جاتا ہے اور دن بھر میں پیش آنے والے واقعات اور اپنی مصروفیات کا جائزہ لیتا ہے۔ ابھی جب وہ نیچے جائے گا۔ اسے بیکری سے انڈے اور ڈبل روٹی لانے کو کہا جائے گا۔ پھر اسے قصائی کی دکان پر بھیج دیا جائے گا۔ مگر شاید آج نہیں کہ سب کا کھانا پڑوس والوں کے ہاں ہے۔ البتہ جب وہ ناشتہ کر رہا ہو گا تو ہر ایک کو اپنے اپنے کام یاد آنے لگیں گے۔ فلاں کے ہاں سے سلے ہوئے کپڑے لا دو۔ فلاں کے گھر یہ پیغام دے آؤ۔ فلاں کو چھوڑ آؤ فلاں کو لے آؤ۔ وہ موٹروں، تانگوں، بسوں، رکشاؤں اور ٹریفک کے اصولوں

کی خلاف ورزی کرتے سائیکل سواروں سے بچتا۔ بچا تا بڑی مشکل سے ایک مہم سے واپس آتے گا تو اسے کسی دوسری مہم پر روانہ کر دیا جاتے گا۔ اسے آج پہلی بار احساس ہو رہا ہے کہ وہ یہ مہمیں سر کرتے کرتے اکتا چکا ہے اسے لگتا ہے۔ جیسے وہ ان سب کا بیٹا، بھائی۔ دیور اور چچا نہیں زر خرید غلام ہے، باؤجی تو پھر باپ ہیں انہوں نے اسے پیدا کیا ہے۔ اگرچہ کچھ احسان نہیں کیا۔ مگر حد یہ ہے کہ ان کے دوستوں کے دوست بھی اس پر حق رکھتے ہیں۔ اور جب اور جہاں چاہتے ہیں اسے بیگار میں پکڑ کر بھیج دیتے ہیں وہ جیب خرچ سے بچا کر چند لیٹر پٹرول موٹر سائیکل میں ڈلواتا ہے کہ کہیں گھوم آتے مگر اُسے بھابی کا سندیسہ لے کر ان کے میکے جانا پڑ جاتا ہے اور جب وہ ان کے میکے جاتا ہے تو بھائی کی بھابی اسے اپنی بھابی کے ہاں کسی کام سے روانہ کر دیتی ہیں اور تو اور منی اور پپو بھی اس پر حکم چلا لیتے ہیں۔ چچا ہمیں سیر کرا دو۔ ہمیں چڑیا گھر لے چلو ہمیں آئس کریم کھلا دو اس کی زندگی بھی کیا زندگی ہے۔ وہ دکھ سے سوچتا ہے۔ گھر ہو یا دفتر ہر جگہ اس کے بہت سے آقا موجود ہیں۔ جو اسے اپنا غلام سمجھ کر احکامات جاری کرتے رہتے ہیں۔ اور جیسے اس کی اپنی کوئی پسند یا مرضی نہ ہو اس کی اپنی کوئی شخصیت نہ ہو ہر کوئی اس پر اپنی پسند اور مرضی ٹھونسنا چاہتا ہے۔ گھر میں جو پکا ہے وہ کھانا پڑتا ہے جو دوسرے چاہیں وہ کرنا پڑتا ہے۔ دفتر کے جیسے بھی ضابطے ہوں یا ان میں کیسی بھی ترامیم ہوتی رہتی ہوں اسے موسٹ اوبیڈینٹ سرونٹ بن کر ان کی تعمیل کرنا پڑتی ہے تو کیا وہ دوسروں کے احکامات بجا لانے اور ان کی مرضی کے مطابق زندگی گذارنے کے لئے پیدا ہوا ہے خود اس کا اپنے اوپر کوئی حق نہیں اسے کسی بات کا اختیار نہیں افسوس اس نے آج سے پہلے کبھی اس پر غور نہیں کیا کہ کسی کو اس کے جذبات و محسوسات جاننے کی پرواہ نہیں۔ لیکن وہ ایسا نہیں ہونے دیگا۔ وہ انہیں بتائے گا۔ کہ اس کی اپنی آزاد اور خود مختار شخصیت ہے۔ اور کسی کو اس کی آزادی سلب کرنیکا کوئی حق نہیں

وہ چونکتا ہے۔ منّی اخبار لے کر اندر آتی ہے اور پتاجی پر رکھ کر چلی جاتی ہے۔ وہ اخبار اٹھا کر شہ سرخی پڑھتا ہے۔ شاید شارکیں کہیں پڑوس کے کسی چھجّے پر جا بیٹھی ہیں دور سے ان کی آواز سنائی دیتی ہے۔

"جھوٹ، جھوٹ، جھوٹ"

وہ اخبار اٹھا کر ایک طرف رکھ دیتا ہے۔ اور سگریٹ سلگا کر پینے لگتا ہے سگریٹ کا کش لیتے ہوتے اسے ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے اس نے اپنی آزادی اور خود مختاری کا اعلان کر دیا ہو اپنے بہت سے آقاؤں سے بغاوت کا علم بلند کر دیا ہو

اسی لمحے سامنے کے مکان کے چھجے پر ایک موٹا تازہ کوا آ بیٹھتا ہے اور بلند آواز سے کہتا ہے "دروغ"

وہ اٹھ کر کھڑکی کا دوسرا پٹ بھی بند کر دیتا ہے۔ پٹ بند ہونے کی آواز سے کوا اُڑ جاتا ہے۔ لیکن اسے لگتا ہے جیسے وہ چھجے سے اڑ کر اس کے اندر کی کسی منڈیر پر آ بیٹھا ہو اور اس کی ہر بات اور سوچ پر دروغ دروغ کی رٹ لگا کر پانی پھیرنے لگا ہو

تب بھابی اندر آتی ہیں اور ایک نظر اسے دیکھ کر کمرے میں بکھری چیزوں کو ٹھیک کرنے لگتی ہیں، وہ اخبار میں پناہ لینا چاہتا ہے۔ وہ کہتی ہیں "اچھا ہوا تم جلدی اٹھ گئے ناشتہ کر کے مجھے آپا کے ہاں سے کپڑے لا دو انہوں نے ٹانک دیئے ہوں گے؟"

اس کا جی چاہتا ہے وہ ان سے پوچھے کہ کپڑے کس کے ہیں؟ لیکن پھر اسے خیال آتا ہے کہ جب اسے لا کر دینے ہی نہیں ہیں تو اسے اس سے کیا غرض کہ کپڑے بھابی کے اپنے ہیں یا انہوں نے پڑوس والوں کے لئے بنائے ہیں

"بھابی آپ کسی اور سے منگوا لیجئے مجھے آج ایک ضروری کام سے کہیں جانا ہے"

"ایسا کون سا ضروری کام آ پڑا ہے تجھے آج کے دن؟"

"کیوں آج کیا ہے۔"

"آج ـــــ تمہیں پتہ تو ہے بھیا۔ آج کیا ہے۔ پڑوس میں تمہاری ضرورت ہوگی۔"

"میری کیا ضرورت ہو سکتی ہے۔"

"پڑوسیوں کے بڑے حقوق ہوتے ہیں۔ محلّے داری ہے آخر"

"مجھے نہیں معلوم" وہ رکھائی سے کہتا ہے "آج مجھے فراغت نہیں۔"

بھابی کچھ دیر خاموش رہتی ہیں پھر کہتی ہیں۔

"تم مرد لوگ بہت بے حوصلہ ہوتے ہو اور خود غرض بھی"

"کیا مطلب؟"

"ذرا سی تکلیف برداشت نہیں کر سکتے۔ آسمان سر پر اٹھا لیتے ہو اور بے چاری عورت"

"پتہ نہیں آپ کیا کہہ رہی ہیں؟"

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ رات تمہارے بھائی جان کے سر میں درد تھا، ساری رات خود سوئے نہ مجھے سونے دیا۔ حالانکہ جب کبھی مجھے رات کو پتّے کا شدید درد بھی ہوتا ہے میں محض اس لئے ہائے وائے نہیں کرتی کہ ان کی نیند خراب نہ ہو"

"آپ بھائی جان کا غصہ مجھ پر اتار رہی ہیں کیسے ہیں وہ"

"اب مزے سے سو رہے ہیں مجھے سر درد میں مبتلا کر کے"

اس کی سمجھ میں نہیں آتا کیا جواب دے۔ لیکن اس خیال سے کہ بات بڑھ نہ جائے وہ نرم لہجے میں کہتا ہے

"میں جلد واپس آجاؤں گا۔"

"اچھا چلو نہا دھو کر ناشتہ کر لو"

"میں ناشتہ بھی وہیں کر دوں گا۔ مجھے جلدی ہے"

اچھا جیسے تمہاری مرضی ـــــ مگر موٹر سائیکل نہ لے جانا۔ تمہارے بھائی جان کو ضرورت ہوگی"

"جی اچھا"

وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آتا ہے منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدلتا اور باہر جانے لگتا ہے اس کی والدہ کہتی ہیں

جلدی آجانا بیٹے۔ بہت سے کام ہیں۔"

"کام کام کام" وہ زیر لب بڑبڑاتا ہے اور تیز تیز قدم اٹھاتا باہر نکل جاتا ہے گلی میں ابھی سے بہت شور اور بھاگ دوڑ شروع ہوگئی ہے۔ شامیانے لگ رہے ہیں۔ قناتیں تانی جارہی ہیں۔ پیاز چھیلے جارہے ہیں اور اینٹیں جوڑ کر بڑے بڑے چولہے بنائے جارہے ہیں۔ اسے ایسا لگ رہا ہے جیسے ابھی کوئی اسے آواز دے کر بلا لے گا۔ وہ جلد از جلد ان آشنا لوگوں اور آوازوں سے دور چلا جانا چاہتا ہے

تھوڑی دور جا کر گلی دو حصوں میں تقسیم ہوگئی ہے وہ پہلے دائیں جانب کو قدم بڑھاتا ہے پھر کچھ سوچ کر بائیں جانب کو مڑ جاتا ہے۔ ابھی دکانیں نہیں کھلیں ویسے بھی آج چھٹی کا دن ہے صرف دودھ دہی بیکری۔ قصاب اور حجاموں کی دکانیں کھلی ہیں دینو حلوائی کی دکان پر نہاری اور حلوہ پوری خریدنے والوں کا ہجوم ہے۔ اس کا جی نہاری کھانے کو چاہتا ہے مگر وہ جلد از جلد اپنی آزادی میں مخل ہونے والے جان پہچان کے لوگوں سے دور نکل جانا چاہتا ہے۔

سڑک پر پہنچ کر اپنی طرف والے بس اسٹاپ پر کھڑا ہو جاتا ہے مگر پھر یہ دیکھ کر کہ دوسری جانب جانے والی بس پہلے آگئی ہے۔ وہ سڑک پار کر کے جلدی سے بس پر سوار ہو جاتا ہے۔ بس کنڈیکٹر ٹکٹ کے لئے کہتا ہے تو فوری طور پر اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کس جگہ کا ٹکٹ خریدے لیکن ساتھ والا مسافر ریلوے سٹیشن

تک کا ٹکٹ مانگ کر اس کی مشکل آسان کر دیتا ہے۔

ریلوے اسٹیشن کے سامنے فٹ پاتھ پر چلتے ایک میلا کچیلا لڑکا جس کے جسم پر صرف ایک قمیض ہے۔ اس کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہے۔

"کیوں مانگتے ہو؟"

"بھوکا ہوں"

"کیوں بھوکے ہو؟"

"میرے ماں باپ نہیں ہیں"

"اچھا ہے نہیں ہیں" وہ کہتا ہے "اگر ہوتے تو تم اپنی مرضی سے بھیک بھی نہیں مانگ سکتے تھے"

وہ لڑکے کو کچھ پیسے دیتا ہے اور آگے بڑھ جاتا ہے۔

ریلوے اسٹیشن پر بہت رونق ہے۔ لوگ آ رہے ہیں جا رہے ہیں۔ انکوائری سے معلومات حاصل کر رہے ہیں۔ قلیوں کو پیسے دے رہے ہیں۔ اپنے عزیز و اقارب سے گلے مل رہے ہیں۔ وہ مختلف گاڑیوں کے اوقات اور کرائے نامے پڑھنے لگتا ہے اس کا جی چاہتا ہے کسی اپ ٹرین میں بیٹھ کر چچا کے ہاں چلا جائے۔ لیکن پھر اس خوف سے کہ اس کے پاس اپنی چچازاد کے سوالوں کا کوئی جواب نہیں وہ ارادہ بدل لیتا ہے۔ پھر اسے خیال آتا ہے کہ کسی ڈاؤن ٹرین کے ذریعے ماموں کے ہاں چلا جائے۔ مگر پھر اسے ممانی کی تیوری کے بل یاد آجاتے ہیں اور وہ کچھ بھی فیصلہ نہیں کر پاتا۔ پلیٹ فارم ٹکٹ خرید کر پلیٹ فارم پر آجاتا ہے۔ اور ایک چکر لگاتا ہے۔ پھر چائے کے اسٹال پر رک کر ناشتہ کرتا ہے۔ ناشتے سے فارغ ہو کر ایک بنچ پر آ بیٹھتا ہے۔ اور گاڑی کا انتظار کرنے لگتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد گاڑی آجاتی ہے۔ وہ ہجوم سے ہٹ کر کھڑا ہو جاتا اور چڑھنے اور اترنے والوں کو خالی نظروں سے دیکھتا رہتا ہے پھر جب

گاڑی چلی جاتی اور پلیٹ فارم خالی ہو جاتا ہے تو وہ دوبارہ اسی بنچ پر آ بیٹھتا اور دوسری گاڑی کا انتظار کرنے لگتا ہے۔ اچانک اس کے ذہن میں سوچ کا ایک چیونٹا کلبلاتا ہے کہ جب اسے معلوم ہی نہیں کہ اسے کہاں جانا ہے تو وہ ایک گاڑی کے چلے جانے کے بعد دوسری اور پھر تیسری گاڑی کا انتظار کیوں کر رہا ہے۔ وہ اٹھ کر ریلوے اسٹیشن سے باہر آتا ہے۔ چوک پر پہنچ کر کچھ دیر سوچتا ہے پھر بڑے بازار کی طرف چل دیتا ہے

تھوڑی دور جا کر اسے اپنا ایک دوست مل جاتا ہے علیک سلیک کے بعد وہ اس سے ضروری کام کا بہانہ کر کے رخصت ہوتا ہے۔ اور کھلی اور بند دکانوں کے آگے سے گذرتا بڑے چوک پر آ جاتا ہے۔ یہاں پرانی کتابوں کے اسٹال ہیں وہ ایک اسٹال پر رک کر کتابوں کی ورق گردانی کرتا ہے۔ پھر دو رویہ سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر چلنے لگتا ہے

چڑیا گھر کا بورڈ دیکھ کر رک جاتا ہے۔ پھر ٹکٹ خرید کر چڑیا گھر میں داخل ہو جاتا ہے۔ چڑیا گھر میں جانوروں اور پرندوں کو کٹہروں اور پنجروں میں بند دیکھ کر اس کا دم سا گھٹنے لگتا ہے۔ وہ جلد از جلد اس ماحول سے نکل جانا چاہتا ہے۔ کہ شیر کے دھاڑنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ شیر کی آواز سن کر چاروں طرف سے تماشائی اس کے کٹہرے کے سامنے جمع ہونے لگتے ہیں۔ کیا دیکھتا ہے۔ کہ شیر فرش پر بیٹھا تماشائیوں کے ہجوم اور قید کی ایک جیسی زندگی سے اکتا کر زور زور سے دھاڑ رہا ہے وہ تماشائیوں سے جس قدر بیزاری کا اظہار کرتا ہے۔ اتنے ہی زیادہ تماشائی جمع ہوتے جاتے ہیں پھر ایک عجیب واقعہ پیش آتا ہے۔ شیرنی اپنی جگہ سے اٹھتی ہے۔ اور اس کے قریب آ کر اپنا سر اس کے سر سے رگڑتی ہے۔ جیسے دلاسہ دے رہی ہو اور شیر کی آواز رفتہ رفتہ تھم جاتی ہے۔ اسے بھابی کی بات یاد آتی ہے۔ کہ تم مرد لوگ بہت بے حوصلہ ہوتے ہو۔ آسمان سر پہ اٹھا لیتے ہو اس کا جی چاہتا ہے۔ تمام پنجروں کے پٹ کھول کر

چڑیا گھر کے سبھی جانوروں اور پرندوں کو آزاد کر دے مگر پھر اسے کمزور جانوروں کا خیال آتا ہے جو کٹہروں سے نکلتے ہی طاقتور درندوں پرندوں کا لقمہ بن جائیں گے وہ آگے بڑھتا۔ اور ہرنیوں کو رلینگوں اور خاردار تاروں سے گھرے جنگلے میں بے فکری سے ٹہلتے دیکھ کر سوچ میں پڑ جاتا ہے۔ کہ وہ جنگل کی نسبت یہاں کس قدر محفوظ ہیں۔ کسی چیتے کی گھات کا ڈر نہ کسی شکاری کی بندوق کا خوف، تو کیا کمزوروں کی بقا صرف قید اور غلامی میں ہے۔ اور وہ آزادی کا ایک دن بھی چین اور اطمینان سے نہیں گذار سکتے؟ ۔ وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پاتا اور جھنجھلا کر باہر نکل آتا ہے۔

دوپہر ڈھلنے لگی ہے۔ اور اسے بھوک ستا رہی ہے۔ وہ ایک چھوٹے سے ہوٹل میں داخل ہو کر کھانا کھاتا ہے۔ پھر سگریٹ کے کش لگاتا ہوا باہر آتا اور سڑک کے کنارے ایک اونچی دیوار پر چڑھ کر بیٹھ جاتا ہے۔ ایک کے بعد دوسرا سگریٹ سلگاتا اور گذرنے والی گاڑیوں کی نمبر پلیٹیں پڑھنے لگتا ہے۔

اچانک اسے خیال آتا ہے کہ وہ حساب لگا کر دیکھے ایک گھنٹے میں مختلف اقسام اور ماڈلوں کی کتنی گاڑیاں وہاں سے گذرتی ہیں۔ اس سے چوبیس گھنٹوں میں وہاں سے گزرنے والی گاڑیوں کا اوسط نکالنے میں آسانی رہے گی۔ پھر وہ ایک ماہ اور پھر ایک سال کا اوسط نکالتا ہے۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اب ان اعداد و شمار کا کیا کرے؟"

دیوار پر چڑھ کر بیٹھے بیٹھے اور گاڑیوں کی تعداد گنتے گنتے سہ پہر ہو جاتی ہے درختوں کے سائے لمبے ہو جاتے اور گرمی کی شدت میں کمی آجاتی ہے۔ وہ ایک طرف کو سایہ دار درختوں کے نیچے چلتا رہتا ہے اور شہر کی سب سے بڑی سیر گاہ میں داخل ہوتا ہے سیر گاہ میں خوش لباس لوگ اور خوبصورت بچے ہر طرف دکھائی دیتے ہیں۔ اسے بچے اچھے لگتے ہیں وہ انہیں دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ مصنوعی آبشاروں سے گرتا پانی اور

چاروں طرف کھلے ہوئے رنگ برنگ خوشنما پھول دیکھ کر اس کے اندر کی گھٹن کم ہونے لگتی ہے۔ اسی لمحے ایک خوبصورت عورت اس کے قریب سے گزرتی اور اسے میٹھی نظروں سے دیکھتی ہے۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگتا ہے۔ یقیناً وہ بھی اس کی طرح تنہا اور ویران ہوگی اور اس نے بھی انہی دنوں اپنی آزادی اور خود مختاری کا اعلان کیا ہوگا۔ مگر پھر اسے مصنوعی جھیل کی طرف پرواز کرتے پرندوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں

"جھوٹ جھوٹ جھوٹ"

"ریا۔ ریا۔ ریا"

"دروغ۔ دروغ۔ دروغ"

اس کے اندر درد کی ٹیسیں جاگتی ہیں۔ وہ پھولوں اور بچوں کی طرف توجہ دینا چاہتا ہے۔ مگر درد کی ٹیسیں پھیلتی چلی جاتی ہیں۔ وہ تھکے ہوتے پاؤں اٹھاتا مین گیٹ کی طرف چل دیتا ہے۔

اس کی جیب میں کرایہ موجود ہے لیکن وہ پیدل چلتا ہے۔ سڑکوں بازاروں اور گلیوں میں گھومتا۔ مکانوں پر لگی نیم پلیٹوں اور دکانوں کے سائن بورڈ پڑھتا چلتا رہتا ہے۔ پھر اسے پتہ ہی نہیں چلتا کہ کب اور کیسے وہ دروغ بھرے دن کے غروب ہونے پر اپنے گھر کی گلی میں داخل ہوگیا۔ لمحہ بھر کے لئے ٹھٹھکتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھا کر چلنے لگتا ہے۔ گلی میں آوارہ کتے جگہ جگہ ہڈیاں چچوڑ رہے ہیں۔ شامیانے اور قناتیں ہٹائی جا چکی ہیں۔ اور اس کے گھر کے سامنے والے چھجے پر کوئی پرندہ موجود نہیں ہے۔ وہ تھکا ہارا نڈھال سا گھر میں داخل ہوتا ہے تو سب لوگ اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔

"کہاں تھے تم؟" والدہ پوچھتی رہیں۔

"سارا دن کہاں غائب رہے؟" بہن کہتی ہے

"ایسا کون سا ضروری کام آپڑا تھا؟" بھائی گرجتا ہے باؤجی غصے میں کمرے سے باہر آتے ہیں اور کہتے ہیں۔

"صبح کے گئے ہوئے تم پورا دن ضائع کرکے اب آرہے ہو تمہیں شرم آنی چاہیئے"

"شرم کس بات کی باؤجی" وہ غصے سے کہتا ہے "کیا مجھے اپنی زندگی کا ایک دن بھی اپنی مرضی سے گذارنے یا ضائع کرنے کا اختیار نہیں؟"

بھابی قریب آتی ہیں اور چڑیا گھر کی شیرنی کی طرح اس کے سر کے ساتھ اپنا سر جوڑ کر کہتی ہیں، "تم تو مرد ہو دل بڑا کرو بھیا ———— آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔

"اب کیا رہ گیا ہے جو ٹھیک ہوجائے گا"

وہ ضبط کرنے کی بہت کوشش کرتا ہے مگر کئی دنوں کا رکا ہوا رونا ضبط کے سارے بندھن توڑ دیتا ہے۔ گھر کے سب لوگ سہم سے جاتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کی آنکھوں میں ان پوچھے سوال کا جواب تلاش کرنے لگتے ہیں۔

وقت سمندر

قلعہ نما عالی شان عمارت کے اندر داخل ہوتے ہی میرے قدم رُک جاتے ہیں۔ مَیں اس منظر کی تاب نہیں لا سکتا اور آنکھیں بند کر لیتا ہوں مگر پھر آنکھیں کھولتا ہوں تو کچھ دکھائی اور سجھائی نہیں دیتا اور کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کونسا وقت اور مقام ہے۔ دن ہے نہ رات ـــــ اندھیرا ہے نہ اُجالا ـــــ طلوع ہے نہ غروب ـــــ موت ہے نہ حیات۔ شاید اس کے بین بین کوئی کیفیت یا سمے ہے یا اس سے ماورا ـــــ کچھ اندازہ نہیں ہو رہا کہ کون سا زمانہ ہے یوں لگتا ہے جیسے آگے پیچھے دائیں بائیں پانی ہی پانی ہے بے رنگ بے بو اور بے ذائقہ پانی ـــــ جو گرم ہے نہ سرد اور جس کے حرکت کرنے یا رُکے ہوئے ہونے کا بھی پتہ نہیں چل رہا مگر یقیناً وہ حرکت کر رہا ہوگا اور مَیں اس میں بہہ رہا ہوں گا۔ پانی کی سلطنت میں ڈوبنے یا بہنے کے سوا چارہ بھی کیا ہے۔ مگر میں نے تو کسی بھی مقام سے اس میں اپنی بے پتوار کشتی نہیں ڈالی۔ پھر میں اس میں کب اور کیسے شامل ہو گیا اور اَب پتہ نہیں کب تک بہتا چلا جاؤں۔ مسلسل بہتے چلے جانے کی ایک جیسی کیفیت کا تصوّر کر کے میں گھبرا جاتا ہوں اور پوچھتا ہوں۔

"کنارا کب آئے گا؟"

"یہاں کنارا نہیں ہوتا۔"

"تمہارا مطلب ہے بہت وسیع سمندر ہے اور کنارے پر پہنچنے کے لیے ابھی بہت دیر لگے گی۔"

"یہاں تمہارے سارے الفاظ بہت، وسیع، سمندر، کنارا، پہنچنا، ابھی، بہت، اور دیر بے معنی ہیں۔"

"تو کیا ہمیں کہیں نہیں پہنچنا ہے؟"

"یہاں پہنچنا اور نہ پہنچنا برابر ہے۔"

"اور اگر میں واپس جانا چاہوں؟"

"یہاں آگے اور پیچھے، دائیں اور بائیں اوپر اور نیچے کا کوئی فرق نہیں۔ یہاں سمتیں ہیں اور نہ نشیب و فراز۔"

"پھر کیا ہے؟"

"ایک تسلسل، ایک دوام، ایک بے پایانی اور ایک لامحدودیت۔"

"تو کیا ہم زمان و مکان سے ماورا کسی مقام پر ہیں؟"

"مقامیت کا تصور یہاں عبث ہے۔"

"تو کیا میں ابدیت کے سمندر میں فنا ہو چکا؟"

"نہیں تم فنا نہیں ہوئے سمندر میں مل کر سمندر ہو گئے ہو۔"

"میں سمندر میں مل کر سمندر نہیں ہونا چاہتا۔ میں اپنی پہچان نہیں کھونا چاہتا۔"

"پہچان یہاں ایک بے معنی اصطلاح ہے اوس، بوند، جھاگ، لہر، موج، حباب اور قطرے کا الگ کوئی وجود نہیں ہوتا سب سمندر کی ہی مختلف صورتیں ہیں تم موج بھی ہو اور دریا بھی۔ قطرہ بھی ہو اور سمندر بھی۔"

سمندر میں مل کر سمندر ہو جانے کے خیال سے مجھے وحشت ہونے لگتی ہے۔ میں چاروں طرف نگاہ دوڑاتا ہوں مگر حد نظر تک پھیلے پانی میں باہر کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا۔

مجھے اپنا سمندر یاد آتا ہے۔

مجھے وہ دن یاد آتے ہیں جب ہم اس کے اتھلے پانیوں میں بے سدھ پڑے دھوپ چوستے اور ہوا پھانکتے رہتے تھے کہ لاکھوں برس بعد ایک روز سانس لینے کی اُمنگ پیدا ہوئی اور ہم عدم سے وجود میں آئے تھے۔ مجھے وہ دن یاد آتے ہیں جب ہم سمندر کی کوکھ سے نکل کر رینگتے ہوئے خشکی کی طرف چلے جاتے تھے لیکن سورج کی تمازت اور بے پانی کی ہوا سے ہمارا دم گھٹنے لگتا اور ہم واپس اس کی آغوش میں پناہ لیتے تھے۔ پھر ایک روز ہم باہر آئے تو ہمیں واپسی کا راستہ نہ ملا۔ شاید سمندر ہمیں چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا تھا۔ یا شوق مہم جوئی میں جو ہماری گھٹی میں پڑا تھا۔ ہم اس سے دور نکل آئے تھے۔ پھر ہم دلدلوں اور جھاڑیوں میں رہنے لگے تھے۔ ہم جھیلوں، تالابوں اور دریاؤں سے دور نہ جاتے تھے۔ اور آسمان بارش کی صورت میں سمندر انڈیلتا تو ہم خوشی سے ناچ اُٹھتے تھے پھر نجانے ہم نے کیا کیا صورتیں بدلیں اور کیسی کیسی صعوبتیں اُٹھائیں اور کہاں کہاں بھٹکتے پھرے۔ ہم اس سے دور چلے جاتے تھے لیکن اس نے ہمیں کبھی فراموش نہیں کیا۔ وہ ہر جگہ اپنی پانی سے لدی ہوائیں ہمارے لیے بھیجتا رہا۔ میدانوں، پہاڑوں، وادیوں اور صحراؤں میں ہم جہاں بھی گئے اس نے اپنے قیمتی تحفوں کا سلسلہ جاری رکھا اور ہماری سرپرستی کرتا رہا۔ ہمارے لیے زمین سے اناج اور سبزہ اگاتا اور درختوں کی پور پور میں نمی پہنچاتا رہا۔

مجھے یاد آتا ہے۔

میں جب کبھی اداس ہوتا اپنے اندر سے نکل کر اس کے کنارے جا بیٹھتا تھا اور ساحل کی طرف آتی موجوں اور نظروں سے اوجھل ہوتی کشتیوں کو دیکھتا رہتا تھا۔ پانی مجھے ہمیشہ مسحور کرتا رہا ہے اسے دیکھتے رہنے سے میری اداسی دُھلنے لگتی تھی۔ اس کی عظمت اور وسعت کا تصوّر مجھے تقویّت دیتا —— وہ عظیم اور مہربان تھا۔ سینکڑوں دریا دن رات اس کے اندر منہ ڈالے اپنی طغیانیاں اُگلتے رہتے تھے مگر وہ چھلکتا نہیں

تھا۔ ہر خطے، ہر رنگ اور ہر نسل کے پانی اس میں مل کر ایک ہو جاتے تھے وہ تین چوتھائی زمین پر پھیلا ہوا تھا۔ اس کا آبی خون بادلوں، دریاؤں اور ندی نالوں کے ذریعے زمین کے سارے بدن میں گردش کرتا تھا۔ وہ ہر جگہ اور ہر مقام پر ہمیشہ ہمارے ساتھ رہتا تھا۔ اور اپنے قوانین کی سختی سے پابندی کر کے ہمارے لیے بہت سی آسانیاں پیدا کرتا تھا۔ ہم جہاں جاتے اس کی سطح سے بلندی کا حساب رکھتے اس کی قربت میں ڈھارس بندھتی اور نیا ولولہ پیدا ہوتا اور اس کے لمس سے ماتا کا احساس ہوتا تھا مگر یہ کیسا سمندر ہے؟

جس کا کوئی اور چھور نہیں۔

جس کا کوئی کنارا ہے نہ ساحل۔

جس کی کوئی سطح ہے نہ تہہ۔

بس ایک ہولناک خاموشی سے بہتا چلا جاتا ہے ـــــ اس کی بے پایانی دیکھ کر فنا کا خوف طاری ہو جاتا ہے۔ پتہ نہیں اس میں بہتے چلے جانے کی کیفیت کبھی ختم بھی ہوتی ہے یا نہیں ـــــ میں ہیبت کے پانیوں میں ڈوبے ڈوبے پوچھتا ہوں۔

"ہم کب تک ـــــ کتنے سال، کتنی صدیاں یونہی بہتے رہیں گے؟"

"صدیاں سال، دن اور لمحے یہ سب الفاظ اضافی ہیں ـــــ ہونا نہ ہونا یہاں ایک ہے۔"

"پھر اس کے بعد؟"

"یہاں پھر نہیں ہوتا اور نہ پہلے اور بعد میں کوئی فرق ہے۔"

"اور میرا ماضی، میری تاریخ ـــــ میری تہذیب؟"

"یہاں ماضی ہے نہ حال اور نہ مستقبل ـــــ تاریخ و تہذیب کا تصور اس گرداب میں لایعنی ہے۔"

"اور حسن اور خوشی اور جذبے اور زندگی؟"

"سب باطل۔"

"اور حرکت، محنت، عمل، ترقی؟"

"لاحاصل۔"

"یہ بہت بڑا دھوکہ ہے۔ یہ ایک سنگین مذاق ہے۔"

"یہی مقدر ہے۔"

"مَیں نہیں مانتا ـــــ میں اپنے پانیوں کو الگ کرنا چاہتا ہوں۔"

"تمہارے پانی؟"

"ہاں میرے پانی ـــــ میں انہیں پہچان سکتا ہوں۔"

اور مجھے یاد آتا ہے۔

وہ ساحل کی ریت پر قلانچیں بھرتی پھرتی تھی۔ سمندر اسے ہمک ہمک کر اور مَیں سہم سہم کر سمندر کو دیکھتا تھا۔ مَیں سمندر دیکھنے آیا تھا مگر وہ مجھے دیکھنے نہیں دیتی تھی۔ بار بار سامنے آجاتی اور اسے اپنی اوٹ میں چھپا دیتی تھی۔ وہ میرے ساتھ آئی تھی مگر سمندر کے کنارے پہنچتے ہی اتنی تبدیل ہوگئی تھی کہ لگتا تھا ابھی چھلک جائے گی۔ "آؤ پانی میں اُتریں۔" اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر پانی کی طرف کھینچتے ہوئے کہا تھا مجھے شرارت سوجھ رہی تھی۔

"تم پانی میں نہ اُترنا پلیز۔"

"کیوں کیا ہے مجھے؟"

"تمہیں تو کچھ نہیں اور نہ ہوگا سمندر میں طغیانی آجائے گی۔"

وہ کھلکھلا کر ہنسی تھی اس کی جگمگاتی ہنسی کی آواز سمندر کے پانی پر دور تک دکھائی دیتی رہی تھی۔ پھر نظروں سے اُوجھل ہوگئی تھی۔ ایک لہر آئی تھی اور ہمیں گدگدا کر واپس چلی گئی تھی۔ یقیناً وہ لہر کسی نہ کسی صورت میں کہیں نہ کہیں اب بھی موجود ہوگی۔

مجھے یاد آتا ہے۔

ہم سکوٹر پر سوار پہاڑ پر جا رہے تھے کہ ہمیں بارش نے آلیا تھا اور ہمیں بھگو کر نیچے ندی میں اُتر گئی تھی۔ بارش میں بھیگ اور دھل کر وہ اور نکھر آئی تھی اور قوس قزح بن گئی تھی۔ قوس قزح سے آلودہ وہ پانی بھی یقیناً یہیں کہیں ہوگا اور وہ پانی بھی جو ہماری موجودگی میں دیوداروں سے گھرے آبشار سے گرتا رہا تھا اور دریا کا وہ پانی بھی جس پر میں اسے کئی برس تک فراقیہ چٹھیاں لکھتا رہا تھا۔

"مجھے میرے پانیوں کا حساب چاہیے۔"

"تم پھر بھول گئے یہ وہ سمندر نہیں ہے۔"

"پھر یہ کون سا سمندر ہے؟"

"اس کا کوئی نام نہیں لیکن اگر تم اپنی آسانی کے لیے سمندر کہنا چاہتے ہو تو سمندروں کا سمندر کہو۔ بحرِ بے کنار سمجھو۔"

"اور وہ سمندر؟"

"اس بحرِ عظیم میں وہ ایک قطرہ ہے۔"

"اور وہ قطرہ جو مجھے رخصت کرتے وقت ایک بار اس کی آنکھ سے ٹپکا تھا؟"

وہ ہنستا ہے اور ہنستا ہی چلا جاتا ہے مجھے اس کی ہنسی یاد آجاتی ہے۔

"وند چنبے دی لڑی کہ ہنس موتی دانے نکلے حسن انار وچوں۔"

مجھے یاد آتا ہے۔ اس نے کہا تھا جوگی تم جھوٹ کہتے ہو گئے وقت کو کون واپس لاسکتا اور بچھڑے ہوؤں کو ملا سکتا ہے۔ اور وہ اس وقت تک نہیں جانتی تھی کہ وہ جوگی میں خود ہوں اور وقت کی طرح سنگدل نہیں ہوں۔

پھر مجھے یاد آتا ہے۔ جب میں عزت بیگ تھا اور چناب کے کنارے بیلے میں بھینسیں چراتا تھا۔ مجھے تیرنا اور غوطہ لگانا آتا تھا اور میں تند لہروں کے منہ سے اس کے لیے مچھلی چھین لاتا تھا مگر ـــــ اس رات ـــــ اس نے منع کر دیا تھا اور حالانکہ وہ تیرنا

نہیں جانتی تھی وہ طوفانی پانی میں اُتر گئی تھی ـــــ اور کہتے تھے بہتا ہوا پانی اوپر اچھالتا اور رُکا ہوا پانی نیچے دباتا ہے۔ لیکن اسے بہتا ہوا پانی بہالے گیا تھا اور وقت نے مجھے ٹھہرے ہوئے پانی کا جوہڑ بنا دیا۔ جہاں سے بوند بوند بھاپ کی صورت نکل بھاگنے میں میرا پورا جنم صرف ہو گیا تھا۔

مجھے یاد آتا ہے ہزاروں لاکھوں برس پہلے ہم ایک ساتھ چلے تھے مگر ہر زمانے میں ہمیں ایک دوسرے کے قریب رہنے کے لیے طرح طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا رہا تھا۔ روحانی اور جسمانی اذیتیں دی جاتی تھیں۔ زہر پھانکنے اور دریا میں کود جانے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ سانپوں سے ڈسوایا اور درندوں کے آگے پھینک دیا جاتا تھا۔ قبر میں زندہ گاڑ دیا اور دیواروں میں چن دیا جاتا تھا اور اس بار بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ ہمارے درمیان اجنبیت کی بلند دیوار اُٹھا دی گئی تھی اور ہم ایک دوسرے کے قریب رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے کو جاننے اور پہچاننے سے قاصر تھے اور ہمیں ایک دوسرے کو جاننے اور پہچاننے کے لیے اپنی قیمتی اور مختصر زندگی کے بہت سے سال ضائع کرنا پڑے تھے۔

مجھے یاد ہے ہمارے گھر کے پچھواڑے میں جامن کا ایک پیڑ تھا۔ جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ اس پر آسیب رہتا ہے جو خوبصورت اور نوخیز لوگوں کو چمٹ جاتا ہے۔ ہر سال پیڑ جامنوں سے لد جاتا مگر کوئی اس کے قریب نہ جاتا تھا۔ جامنوں کے بوجھ سے نرم لچکیلی شاخیں جھکنے لگتیں، ٹہنیوں سے لگی لگی جامنیں سوکھنے اور سڑنے لگتیں مگر کوئی اتارنے نہ آتا اور پوری بستی میں میں پہلا شخص تھا جس نے فیصلہ کیا تھا کہ جامن کو آسیب کے قبضہ سے واگزار کرایا جائے مگر جب میں نے اس کا پھل چکھا تو جامن کا ایک پیڑ میرے اندر اُگنے لگا اور برسات سے پہلے ہی ساری ٹہنیاں ہری اور لال جامنوں سے لد گئیں۔

مجھے یاد آتا ہے۔

ہر سال دریا بند توڑ کر گھروں، آنگنوں، کھیتوں اور گلیوں میں آجاتا اور جاتے ہوئے

بہت کچھ اپنے ساتھ بہالے جاتا تھا۔ سامان، اناج مویشی اور آدمی۔ اور جب پانی اُترتا تھا تو بعض کھوئی ہوئی چیزیں اچھی یا بُری حالت میں مل بھی جاتی تھیں مگر ایک بار دریا بستی کی سب سے قیمتی چیز بہا کر لے گیا اور قیمتی چیزیں کون واپس کرتا ہے۔ پانی اُترا تو اس کی ہر جگہ تلاش ہوئی مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ بستی کے لوگوں کا خیال تھا کہ وہ کسی امدادی کشتی میں سوار ہو کر چلی گئی تھی مگر مجھے معلوم تھا وہ اپنے قدیم آبائی گھر چلی گئی تھی اور کسی دوسرے زمانے میں میرا انتظار کرتی تھی۔

اور موسم آتے جاتے رہے۔

جامنیں پکتی اور سڑتی رہیں۔

اور دُبلی گائیں ساری فربہ گایوں کو اور سوکھے خوشے ہرے ہرے خوشوں کو کھا گئے۔

اور پھر کئی برسوں یا شاید صدیوں کے بعد جیسے کسی نے مجھے خنجر بھونک دیا۔ "وہ زندہ ہے۔"

اور میرے اندر کوئی گردان کرنے لگا۔ "وہ زندہ ہے میں زندہ ہوں تو زندہ ہے ہم زندہ ہیں۔"

اور میں یہ تو بتانا ہی بھول گیا کہ کھو جانے سے پہلے اس کے حسن کا دُور دُور تک شہرہ تھا اور اسے قدرت کا حسین شاہکار خیال کیا جاتا تھا۔ اگرچہ بستی میں اس کی موجودگی میں چراغ جلانے پر کوئی پابندی نہیں تھی اور اسے ہر صبح پھولوں سے تولا بھی نہیں جاتا تھا۔ مگر بستی میں ساری رونق، روشنی اور چہل پہل اسی کے دم سے تھی۔

مجھے یاد آتا ہے میں اسے دیکھ کر لرز گیا تھا۔

مجھے یقین نہیں آیا تھا کہ وہ سچ مچ وہی ہے۔

اسے دیکھ کر وقت کی سفاکی اور انسان کی بے مائیگی کا احساس شدید ہو گیا تھا۔

میں اسے اس حال میں دیکھوں گا۔ اس کا میں نے کبھی تصوّر تک نہیں کیا تھا۔ مجھے وہ لہلہاتے

دن یاد آئے تھے جب وہ محض دیکھنے سے گلابی عنابی ہو جاتی اور چھو لینے سے اس کے جسم میں برقی رو دوڑ جاتی تھی۔ مگر اب لگتا تھا جیسے کسی نے پیچھے سے مین سوئچ بند کر دیا ہو۔

اور اس نابینا بڑھیا کی پکار سن کر یوسف گھوڑے سے اُتر آیا اور اسے پہچان کر رو پڑا۔

یوسف پُچھے دس زلیخا حسن کتھے اج تیرا۔

کہے زلیخا ہجر رڑھایا ہتھ نہ پہتا میرا۔

یوسف پُچھے دس زلیخا کتھے لب دی لالی

کہے زلیخا جال سدھائی لاٹ فراقاں والی

یوسف پُچھے دس زلیخا زلفاں کدھر گیاں

کہے زلیخا . . . . .

یوسف پُچھے . . . .

وہ ایک قلعہ نما عالی شان عمارت تھی اور وہ وہیل چیئر میں پتھرائی پڑی تھی وہ بول سکتی تھی نہ سن سکتی تھی اور نہ اپنی جگہ سے حرکت کر سکتی تھی۔

اس کی ایک آنکھ خشک تھی اور دوسری میں ایک آنسو بس امنڈنے ہی والا تھا —

اور تب سے —— جب سے میں نے اسے دیکھا ہے مجھے پتہ نہیں چل رہا کہ کون سا وقت اور مقام ہے۔ دن ہے نہ رات۔ اندھیرا ہے نہ اُجالا۔ طلوع ہے نہ غروب۔ یوں لگتا ہے جیسے آگے پیچھے دائیں بائیں پانی ہی پانی ہے۔ بے رنگ، بے بو اور بے ذائقہ پانی جو گرم ہے نہ سرد اور جس کے حرکت کرنے یا رُکے ہونے کا بھی پتہ نہیں چل رہا۔

رابطہ

ہم دونوں ایک ہی گھر میں رہتے ہیں۔

مجھے نہیں معلوم کہ اسے میری موجودگی کا احساس ہے یا نہیں۔ البتہ میں اسے گھر کے مختلف گوشوں میں چلتے پھرتے اکثر دیکھتا رہتا ہوں۔

یوں تو پتہ نہیں وہ کب سے یہاں ہے لیکن میرے اس سے یک طرفہ تعارف کو کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ چند ماہ پہلے ایک روز میں نے اسے باورچی خانے کے فرش پر اپنے سے کئی گنا بڑا خوراک کا ایک دانہ کھینچتے ہوئے دیکھا اور اس کی ہمت اور حوصلہ دیکھ کر چونکا تھا۔ پھر اس کے کچھ ساتھی آ گئے اور وہ خوراک کا یہ دانہ ان کے سپرد کر کے ایک طرف کو یوں چل دیا جیسے اسے اس سے اہم تر کسی کام یا مہم پر جانا ہو۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ جب اس کا ٹھکانہ باورچی خانے ہی کے کہیں قریب واقع تھا اور وہاں خوراک کی وافر مقدار موجود تھی تو وہ کسی اور سمت کو کیوں نکل گیا؟ میری دلچسپی بڑھ گئی۔ میں نے اس کا تعاقب شروع کر دیا اور وہ میرے دیکھتے ہی دیکھتے برآمدے کا عرض عبور کر کے صحن کی طرف روانہ ہو گیا مگر پھر لمبی لمبی گھاس میں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

دو ایک روز بعد میں نے اسے صحن کے ایک کونے میں درخت سے اترتے دیکھا۔ یقیناً

وہ ایک ایک ڈال پات کا چکر لگا آیا تھا۔ مجھے تجسس ہوا کہ آخر اسے کس چیز کی تلاش تھی۔ یوں لگتا تھا۔ جیسے وہ کسی لمبے سفر پر نکلا ایسا مہم جو ہو جو گہرے رازوں سے پردہ اُٹھانا اور نئی نئی دُنیائیں دریافت کرنا چاہتا ہو۔ میری اس میں دلچسپی بڑھتی رہی اور میں بھی اس کے ہمراہ اپنے ہی گھر میں رہتے ہوئے دور دراز کے سفروں پر نکل جاتا۔ دشوار گزار پہاڑوں تاریک اور گہرے غاروں، گھنے جنگلوں، ٹھاٹھیں مارتے دریاؤں اور بے کراں پھیلے سمندروں کی سیاحت کرتا میں نے کئی بار محض ایک پتے یا تنکے پر سوار ہو کر سمندر عبور کیا کسی پرندے کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سے گرد و غبار کا شدید طوفان اُٹھتا جس کی لپیٹ میں آکر کسی پہاڑ کی چوٹی سے پھسلتا اور فضا کی لامحدود پہنائیوں سے گزرتا واپس زمین پر آگرتا۔ اس کی جون میں رہتے ہوئے اپنے اصلی وجود کا ادراک جہاں ایک مشکل امر تھا وہاں نہایت دلچسپ اور ولولہ انگیز تجربہ بھی تھا۔ میں اپنے گذشتہ وجود کو یاد کرنے کی کوشش کرتا مگر وہ میرے چھوٹے سے ذہن کی گرفت میں نہ آتا۔ میں کسی بلند جگہ پر کھڑے ہو کر دُور دُور تک دیکھنا چاہتا لیکن مجھے چند انچوں سے آگے کچھ دکھائی نہ دیتا۔ مجھے گھبراہٹ ہونے لگتی اور میں واپس اپنے قالب میں آنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگتا۔

ایک دن، کئی دنوں بعد گہرے بادل گھر آئے۔ ٹھنڈی ہوا کے ساتھ ساتھ بوندا باندی شروع ہوئی۔ میں صحن میں رکھی چیزوں کو سنبھال رہا تھا کہ مجھے اس کا خیال آیا۔ کہیں ایسے موسم میں وہ باہر نہ گھوم رہا ہو۔ میں نے دوربین نکالی اور اسے تلاش کرنے لگا۔ کافی دیر بعد وہ مجھے چھت کی منڈیر پر چلتا دکھائی دیا۔ لیکن میرے وہاں پہنچنے تک بارش تیز ہو گئی اور غالباً اس نے کسی قریبی سوراخ میں پناہ لے لی۔

رات بھر بارش ہوتی رہی۔ جل تھل ایک ہو گیا۔ مجھے برابر اس کا خیال ستاتا رہا کیا پتہ سوراخ میں پانی گھس آیا ہو۔ کیا پتہ وہ بھوکا پیاسا ہو۔ اسے سردی لگ رہی ہو

یا خوف کے مارے کانپ رہا ہو۔

اگلی صبح دُھوپ نکلی تو میں اس کی تلاش میں نکلا۔ ہر جگہ دیکھا مگر وہ کہیں نظر نہ آیا۔ مایوس ہو کر لوٹ رہا تھا کہ بند پر نالے کے قریب جمع پانی پر نظر پڑی۔ میں نے آگے بڑھ کر پرنالے کے منہ سے تنکے ہٹائے تو رُکا ہوا پانی تیزی سے چلنے لگا۔ اچانک میری اس پر نظر پڑی وہ پانی میں بہتا ہوا تیزی سے پرنالے کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے لپک کر اسے بچا لیا۔

میرا شدت سے جی چاہ رہا تھا کہ اسے بتاؤں کہ وہ کس قدر خطرے میں گھر گیا تھا اور میں نے اس پر کتنا بڑا احسان کیا ہے لیکن افسوس میرے اور اس کے درمیان ایسا کوئی رابطہ نہیں تھا۔ ہم باہم کلام کر سکتے تھے نہ ایک دوسرے کے بارے میں کچھ جان سکتے تھے اور حالانکہ میری اس کے بارے میں معلومات نسبتاً زیادہ ہیں لیکن پھر بھی اکثر میں کسی ویسے ہی دوسرے کو اس کی جگہ سمجھ لیتا ہوں اور اس وقت بھی جب وہ میرے سامنے ہوتا ہے میں وثوق سے نہیں بتا سکتا کہ وہ وہی ہے۔ یقیناً وہ بھی جب میری قمیض کے کالر پر چڑھتا یا میری گردن پر کاٹتا ہے نہیں جانتا ہوتا کہ یہ مَیں ہوں۔ اس کا محسن .... جس نے متعدد بار اسے موت کے منہ میں جانے سے بچایا ہے اور جس کی وجہ سے وہ زندہ اور محفوظ ہے اسے تو یہ بھی معلوم نہیں ہوگا کہ اگر مَیں یہ گھر جس وہ رہتا ہے نہ بناتا تو شاید وہ پیدا ہی نہیں ہوتا یا اگر کہیں کسی دوسری جگہ پیدا ہو بھی جاتا وہ عین مَین وہی نہ ہوتا کوئی اور ہوتا اور اگرچہ اسے پتہ نہیں ہے کہ اسے تھوڑی سی تگ و دو کے بعد خوراک کیسے مل جاتی ہے اور یہ کہاں سے آتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی زندگی میری انہی عنایات کی مرہون منت ہے۔ یہی نہیں میں چاہوں تو پھونک مار کر اسے ہلاک کر سکتا ہوں۔ چٹکی بجانے میں اسے مسل سکتا ہوں اور ذرا سی بے احتیاطی سے چلوں تو اسے اس طرح کچل سکتا ہوں کہ اس کے وجود کا سراغ تک نہ ملے۔ کاش اسے یہ سب باتیں

معلوم ہو جائیں۔ لیکن افسوس مَیں اُسے کچل تو سکتا ہوں۔ پھونک مار کر ہلاک تو کر سکتا ہوں لیکن اپنی نوازشات کے صلے میں اس کے منہ سے شکریے کے الفاظ نہیں سن سکتا تاہم اس سے رابطہ کی خواہش کے پس پردہ محض شکریہ کے بول سننے کی خواہش نہیں کوئی اور جذبہ بھی ہے جس کا پوری طرح سے مجھے خود بھی علم نہیں ہے۔ بس ایک انجانا سا دکھ ہے کہ میں اور وہ ایک ہی جگہ، ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے محض ذہن اور جسامت کے فرق کی وجہ سے ایک دوسرے سے ہمکلام نہیں ہو سکتے۔ اپنی اپنی دُنیا کی کہانی نہیں کہہ سکتے۔

مَیں نے کئی بار سوچا ہے کہ اسے نظر انداز کر دوں، بھول جاؤں، اس کے بارے میں سوچنا چھوڑ دوں۔ لیکن پھر ایسا ہوتا ہے کہ وہ مجھے اچانک نظر آ جاتا ہے تکیے کے غلاف پر رضائی یا کمبل پر رینگتا ہوا، ردّی کی ٹوکری کے کنارے، کسی دیوار یا چھت پر چلتا ہوا اور میں نئے سرے سے اس کا تعاقب شروع کر دیتا ہوں یہ جاننے کے لیے کہ آخر اس کی زندگی اور تگ و دو کا راز کیا ہے اور وہ باورچی خانے یا سٹور روم کو چھوڑ کر جگہ جگہ کیا تلاش کرتا پھرتا ہے۔

کبھی کبھی میں اس کے بارے میں دلچسپ باتیں سوچتا ہوں مثلاً یہ کہ ممکن ہے وہ اپنے ساتھیوں اور ہم جنسوں میں سب سے زیادہ ذہین ہو۔ اس نے ایک روز ان سب کو ایک جگہ جمع کر کے دعوے کیا ہو کہ ان کے آس پاس ایک نہایت عظیم وجود یعنی میں موجود ہوں۔ اس کی باتیں سن کر ان سب نے اس کی ہنسی اڑائی ہو اور اسے خبطی اور گمراہ قرار دیا ہو عین ممکن ہے۔ ان سب نے مل کر اسے مجبور کیا ہو کہ وہ اپنے اس دعویٰ سے دستبردار ہو جائے ورنہ اسے زہر کا پیالہ پینا ہو گا۔ سولی پر چڑھنا ہو گا اور اب وہ اس دنیا کی پیمائش اور میری تلاش میں نکلا ہو۔ مَیں اسے گھر کے مختلف کمروں کونوں کھدروں اور دشوار گزار جگہوں پر گھومتے دیکھتا ہوں تو میرا شک یقین میں بدل جاتا ہے کہ اسے واقعی کسی خاص شے کی تلاش ہے۔ میرا جی چاہتا ہے میں اس کی مدد کروں اُسے

بتاؤں کہ وہ جسے گھر کی فضاؤں، کمروں دیواروں، چھتوں، باورچی خانے کے ڈبوں، سٹور روم کے صندوقوں، ڈرائینگ روم کے صوفوں، باغیچے کے پودوں اور گھر کی چار دیواری کی ایک ایک اینٹ میں تلاش کرتا پھر رہا ہے وہ میں ہوں اور اس کے سامنے موجود ہوں لیکن افسوس وہ میرے سامنے ہوتے ہوئے بھی مجھے نہیں دیکھ سکتا۔ میری آواز نہیں سُن سکتا۔ وہ تو یہ اندازہ لگانے سے بھی قاصر ہوگا کہ وہ میرے مقابلے میں کس قدر حقیر اور کمزور ہے اور اگر اسے ایسی کروڑوں زندگیاں دی جائیں اور وہ کبھی بھی ہمت نہ ہارے تب بھی وہ مجھے دریافت نہیں کر سکتا لیکن اس کے ساتھ ساتھ مجھے اپنی بے بسی اور کم مائیگی کا بھی رہ رہ کر احساس ہوتا ہے کہ میں اپنی بات اس تک نہیں پہنچا سکتا۔ اس سے خواہش کے باوجود رابطہ قائم نہیں کر سکتا۔ اس کے ذہن میں کوئی الہامی کیفیت پیدا نہیں کر سکتا۔

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ اُسے آہٹوں کی وجہ سے میری موجودگی کا شبہ یا احساس ہے اور وہ سچ مچ مجھے تلاش کر رہا ہے تو اس کی تلاش کا نتیجہ کس قدر دلچسپ ہوگا وہ اس گھر کو جس کا اس نے کئی ہفتوں مہینوں میں چکر لگایا ہے۔ پوری کائنات سمجھتا ہوگا اور جب وہ ایک روز اپنے ان گنت ہم جنسوں کو جمع کر کے اعلان کرے گا کہ اگرچہ وہ اس عظیم وجود کو دیکھنے سے قاصر ہیں جو ان کے آس پاس میں کہیں موجود ہے لیکن شواہد بتاتے ہیں کہ وہ بہر حال موجود ہے تو وہ اس کا کس قدر مذاق اڑائیں گے اور وہ خود کس قدر غلطی پر ہوگا۔ جب وہ انہیں بتا رہا ہوگا کہ اس نے تمام دُنیا کھنگال ڈالی ہے۔ اس بے چارے کو کیا علم کہ اس نے جس کو پوری کائنات سمجھا ہے وہ محض ایک گھر ہے اور ایسے بیسیوں گھر ایک گلی میں ہوتے ہیں۔ اور ایسی سینکڑوں گلیاں ایک شہر میں اور ایسے ہزاروں شہر اس دُنیا میں موجود ہیں کاش وہ اندازہ کر سکتا کہ وہ زمین جس پر ایسے ہزاروں لاکھوں شہر موجود ہیں۔ کائنات میں اس

کی حیثیت باورچی خانے کے فرش پر گرے ہوئے چینی کے ایک دانے یا ایک بیضہ مور کی سی ہے۔ لیکن افسوس وہ اندازہ نہیں لگا سکتا اور میں اسے بتا نہیں سکتا۔ کیونکہ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے بھی ہمارا آپس میں ایسا کوئی رابطہ نہیں ہے اور نہ ہی مستقبل قریب یا بعید میں اس کا کوئی امکان ہے۔

رہائی

"مَیں خودکشی کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیوں ؟"

"تاکہ تم سے نجات حاصل کر سکوں۔"

"تم مجھ سے نجات حاصل کرنا کیوں چاہتے ہو ؟"

"مَیں تم سے اُکتا گیا ہوں، تمہاری موجودگی میں میرا دم گھٹتا رہتا ہے۔"

"اس سے پہلے تو تم نے کبھی اس کا اظہار نہیں کیا۔"

"مَیں تم سے شروع سے ہی نفرت کرتا ہوں لیکن اَب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا ہے۔ اَب مَیں تمہیں مزید برداشت نہیں کر سکتا۔"

"تمہیں ایسا نہیں سوچنا چاہیے زندگی بہت قیمتی چیز ہے۔"

"مَیں ہر لمحہ مرنے کی اذیت سے چھٹکارا حاصل کرنا اور ایک ہی بار مر جانا چاہتا ہوں۔"

"یہ بُزدلی ہے۔"

"میرے لیے اب بہادری اور بُزدلی میں کوئی فرق نہیں رہا۔"

"خودکشی حرام ہے۔"

"ہاں حرام ہے لیکن تم نے میرا جینا بھی تو حرام کر رکھا ہے تم نے میرے لیے زندگی اور موت میں کوئی فرق نہیں رہنے دیا۔"

"مَیں تمہیں ایسا کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

"مجھے خودکشی کے لیے بھی تمہاری اجازت کی ضرورت ہے یہی میری نفرت کا سبب ہے۔ کاش مَیں کوئی کام تو اپنی مرضی سے بھی کر سکتا۔"

"تم سمجھنے کی کوشش کرو۔ ہم میں سے کوئی بھی اتنا آزاد نہیں ہے۔ مَیں تمہیں آزاد نہیں چھوڑ سکتا۔ کیونکہ مَیں خود کسی دوسرے کی مرضی کا پابند ہوں اور وہ دوسرا کسی تیسرے کا۔"

"مَیں کچھ نہیں جاننا چاہتا سوائے اس کے کہ مجھے کم از کم خودکشی کی اجازت تو ملنی چاہیے۔"

"زندگی خدا کا عطیہ ہے مَیں چاہتا ہوں تم زندہ رہو۔ زندگی سے لُطف اُٹھاؤ۔"

"لُطف اُٹھاؤں ؟ تمہارے ہوتے ہوئے ؟"

"ہاں —— زندگی کی نعمتوں سے لُطف اندوز ہونے کے لیے تمہیں مجھے برداشت کرنا ہوگا۔"

"مَیں ایسا نہیں کر سکتا۔"

"آخر کیوں ؟"

"تم —— تم میرے گلے کا طوق —— میرے پاؤں کی زنجیر ہو —— تم نے میری آزادی کو سلب کر رکھا ہے۔ تم نے میری رُوح کو مصلحتوں کے پنجرے میں قید کر رکھا ہے۔ گلے میں طوق ہو پاؤں میں زنجیر ہو رُوح پر ننگی تلوار کا پہرہ ہو تو کوئی کیسے خوش رہ سکتا اور زندگی کا لُطف اُٹھا سکتا ہے۔"

"یہ تمہارا اور میرا —— ہم سب کا مقدر ہے تمہیں اس کے ساتھ سمجھوتہ کرنا ہوگا۔"

"مَیں مزید کوئی سمجھوتہ نہیں کر سکتا۔ مَیں سمجھوتوں اور مصلحتوں کے اَن گنت دیا عبور

کرتے کرتے عاجز آچکا ہوں۔ اکتاہٹ اور بیزاری نے میری زندگی اجیرن کر دی ہے۔"

"لیکن ذرا سوچو ـــــ اس کے باوجود ہونا ـــــ نہ ہونے سے کس قدر افضل ہے۔"

"مجھے اپنے ہونے اور نہ ہونے میں کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا۔ سوائے اس کے کہ مَیں اذیّت میں مبتلا ہوں۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم پیر تسمہ پا کی طرح گردن پر سوار رہو گے تو مَیں کبھی یہاں نہ آتا۔ خلا میں ہی رہتا۔ افسوس مجھے مٹّی نے مایوس کیا۔"

"مٹّی کسی کو مایوس نہیں کرتی۔"

"مٹّی مایوسیوں، ناکامیوں اور اذیتوں کا احساس دلاتی ہے۔ اس کی کشش کے دائرے سے باہر نکلنا چاہتا ہوں۔"

"اس نے تمہیں گود لیا۔ اپنے پانیوں سے تمہاری آبیاری کی۔ اپنی ہواؤں کے جھولے میں جھلایا۔ اَب تم اسے مایوسی کا طعنہ دیتے ہو کیا یہ احسان فراموشی نہیں۔"

"کاش اس نے میرے گلے میں تمہاری غلامی کا طوق نہ ڈالا ہوتا۔"

"مَیں تمہارے گلے کا طوق نہیں ہوں تمہاری ترقّی اور بہتری کا وسیلہ ہوں۔"

"تم اس کو ترقّی کہتے ہو؟"

ہاں ـــــ میری وجہ سے تمہیں فضیلت حاصل ہوئی۔ یاد کرو تم کیا تھے اور مَیں نے تمہیں کس مقام پر پہنچایا۔"

"تم نے مجھے بہت سی آسائشیں دیں۔ لیکن تم نے مجھ سے آزادی اور خودمختاری چھین لی۔"

"مَیں نے تم سے کچھ نہیں چھینا۔ جو کچھ تمہیں کبھی حاصل نہیں تھا فقط اس کا احساس دلایا۔"

"یہی تمہارا جرم ہے۔ مَیں بے لباس تھا لیکن عریاں نہیں تھا۔ تم نے مجھے لباس دیا اور احساس عریانی بھی۔ مَیں خالی ہاتھ تھا لیکن کسی محرومی کے احساس سے دوچار نہیں تھا۔

تم نے میرے اردگرد چیزوں کے انبار لگا دیے لیکن میری روح کو بے اطمینانی کے پنجرے میں قید کر دیا۔ مایوسی اور احساسِ گناہ سے دوچار کر کے تم نے مجھے خودکشی پر مجبور کیا ہے۔"

"مَیں نے تمہیں جو کچھ دیا وہی تمہاری فضیلت ہے۔"

"مجھے فضیلت نہیں خوشی درکار ہے۔"

"فضیلت بذاتِ خود ایک بہت بڑی خوشی ہے تم اس کا احساس تو کرو۔"

"مَیں زندگی کے کھونٹے سے مزید بندھا رہنا نہیں چاہتا۔ میں واپس خلا میں جانا چاہتا ہوں۔"

"تم ناشکرے ہو ـــــ خلا کی بے معنی وسعتوں میں بھٹکنا چاہتے ہو۔"

"وہاں سکون ہے۔ وہاں بدی کا گزر نہیں۔ شر کی رسائی نہیں۔ محرومی، مایوسی اور بے بسی کا احساس نہیں۔ موت کا خوف نہیں۔ ناانصافی نہیں۔ علالت و عسرت نہیں اور قید مقام نہیں۔ خلا کی وسعتیں مجھے پکارتی ہیں۔"

"خلا کبھی کسی کو نہیں پکارتا ـــــ وہ کشش سے محروم ہے۔ وہ خوشی اور غم، محبت اور نفرت، زندگی اور موت تمام ذائقوں سے خالی ہے اور یہ تمہاری بدقسمتی ہے کہ تم مٹّی میں رہتے ہو مگر خلا کے گُن گاتے ہو حالانکہ سچی ابدیت مٹّی سے وابستگی میں ہے۔ افسوس تم نے خلا کی بانجھ وسعتوں کے لیے سچی نعمتوں کے حقیقی ذائقوں کو اپنے اوپر حرام جانا ـــــ یہ کفرانِ نعمت ہے۔ تمہیں اس کی سزا کے لیے تیار رہنا چاہیے۔"

"یہ سزا میرے لیے ایک عظیم تحفہ ہوگی۔ اگر مجھے زمین بدر کر دیا جائے۔"

"مٹّی آنے والوں کا خوش دلی سے استقبال کرتی ہے۔ ان کے ننگے بدنوں کو لباس مہیا کرتی ہے، لیکن کسی کو جانے کی اجازت نہیں دیتی۔"

"مَیں مٹّی کو اس کا دیا ہوا لباس واپس کرنا چاہتا ہوں۔ یہ سکڑ کر تنگ ہو گیا ہے۔ اس

میں میرا دم گھٹتا ہے۔"

"یہ لباس تمہاری پہچان ہے۔ یہ لباس تم ہو۔ اس کے بغیر تم کچھ بھی نہیں ہو۔"

"مَیں اپنی شناخت کھونا چاہتا ہوں۔ میں بے نام ہونا چاہتا ہوں۔ مَیں مشرق مغرب شمال جنوب کی قید سے رہائی چاہتا ہوں۔ مَیں بے سمت خلاؤں میں بھٹکنا چاہتا ہوں۔"

"تمہارا نام حاضری کے رجسٹر میں درج ہو چکا ہے۔"

"میرا نام حاضری کے رجسٹر سے خارج کر دیا جائے۔"

"اس رجسٹر میں جو نام ایک بار لکھا جاتا ہے اسے مٹایا یا خارج نہیں کیا جا سکتا۔ واپسی کا خیال چھوڑ دو —— واپسی کے سارے راستے بند ہیں۔"

"یہ ظلم ہے نا انصافی ہے۔"

"یہ ظلم اور بے انصافی نہیں۔ یہ زندگی کی اوّلین شرط ہے اور اگر یہ جرم ہے تو تم خود بھی اس کا ارتکاب کر چکے ہو۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ اگر تمہیں خلا کی ویرانیاں اس قدر عزیز تھیں تو تم نے مٹی اور ہریالی کے لمس کی خواہش کیوں کی تھی اور زندگی کے سمندر میں اُترتے ہی تم نے لائف بیلٹ پر قبضہ کرنے کے لیے قتل عام کیوں کیا تھا؟"

"مَیں اس کی تلافی کرنا چاہتا ہوں۔"

"تلافی کے لیے ضروری ہے کہ تم زندگی کی حفاظت کرو۔"

"جس کا انجام ناپائیداری اور فنا کے سوا کچھ نہ ہو اس کی حفاظت کیسے اور کب تک کی جا سکتی ہے۔"

"جب تک اس کا اذن ہو۔"

"کچھ بھی ہو مَیں رہائی چاہتا ہوں میں مٹی کا لباس اُتار کر ابدیت سے ہمکنار ہونا چاہتا ہوں۔"

"کیا تمہیں بانجھ ابدیت کے کبھی نہ ختم ہونے والے جمود سے ہول نہیں آتا؟"

"وہ بلندی اور سرفرازی ہے لامحدود وسعت ہے۔"

"زمین سے بلند کوئی مقام نہیں، زمین خلاؤں کا عرش ہے اس سے جدا ہو کر تم پھر بے معنی بے وقعت اور بے نام ہو جاؤ گے۔"

"لیکن یہاں تم ہو —— غلامی کے سلاسل کی صورت۔"

"ہاں میں ہوں اور مجھے حکم ہے کہ تمہاری حفاظت کروں۔ میں حکم عدولی نہیں کر سکتا"

"لیکن میں حکم عدولی کرنا چاہتا ہوں۔"

"تم ایسا نہیں کر سکتے۔ فرار کے تمام راستے بند ہیں۔"

"میں ایسا کروں گا۔ میں اب مزید تمہارے ساتھ رہنا نہیں چاہتا۔ تم نے اس زمین کو مصائب اور آلام کا گھر بنا دیا ہے۔ تم نے یہاں طرح طرح کے تعصبات، نفرتوں اور ناانصافیوں کے بیج بوئے ہیں۔ زندگی کی ہزاروں صورتیں تھیں۔ لیکن تمہیں صرف اپنی صورت پسند آئی۔ تم اپنے سوا کسی کو آزادی سے جینے کا حق نہیں دیتے۔ میں اب ایک پل بھی یہاں نہیں رکوں گا۔"

"ضد نہ کرو —— اب بھی وقت ہے واپس جانے کا خیال چھوڑ دو۔"

"کیسے چھوڑ دوں —— کس کے لیے چھوڑ دوں؟"

"بہتے دریاؤں، اڑتے بادلوں، نگر نگر گھومتی ہواؤں، چاندنی راتوں، طلوع ہوتی صبحوں، کھلتے پھولوں اور گھگھو گھوہ الاپتی فاختاؤں کے لیے۔"

"میرے لیے سب مناظر اور نغمے بے معنی ہیں۔ آدمی اندر سے خوش نہ ہو تو ساری خوبصورتیاں بدصورتیوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔"

"کیا تم دیکھ سکتے ہو؟"

"ہاں مجھے سب کچھ دکھائی دے رہا ہے۔ لوگ، مشینیں اور اپنا جسم۔"

"پھر تم نے اس کا غم میں ڈوبا ہوا معصوم چہرہ بھی دیکھا ہو گا۔"

"ہاں، دیکھا ہے —— یہ چہرہ مجھے ہمیشہ دھوکا دیتا رہا ہے۔"

"اور آنسوؤں سے لبریز آنکھیں ؟ —— کیا تم نے ان آنسوؤں کو شمار کیا ہے ؟"

"یہ آنکھیں گمراہ کن ہیں میں انہیں دیکھنا نہیں چاہتا۔"

"نہ دیکھو —— مگر تم سن بھی تو سکتے ہو؟"

"ہاں مجھے سب کچھ سنائی دے رہا ہے، کاش میری آواز بھی سنائی دے سکتی اور میں کہتا وہ میرے جسم کو مت چھوئے۔"

"اگر تمہیں اس کی بے گناہی کا اب بھی یقین نہیں ہے تو پھر آؤ —— ایک آواز سنو۔"

"اب —— ابّو —— جی۔"

"یہ آواز ؟ —— یہ کیسی آواز ہے —— کون مجھے پکارتا ہے ؟"

"یہ مٹّی سے تمہارے کبھی نہ ٹوٹنے والے تعلق کی آواز ہے۔"

"میں اس آواز سے رہائی چاہتا ہوں۔"

"تم اس آواز سے رہائی حاصل نہیں کر سکتے کیونکہ یہ تمہاری اپنی آواز ہے۔"

"میں اس آواز کی پہنچ سے دور جانا چاہتا ہوں۔"

"تم اس آواز سے دور نہیں جا سکتے۔ یہ آواز ہر جگہ تمہارا پیچھا کرے گی۔"

"مجھے اس آواز کی کشش سے بچاؤ —— میں لمحہ لمحہ نیچے گرتا جا رہا ہوں۔"

"تم نیچے نہیں گر رہے ہو —— اپنے جسم میں واپس آ رہے ہو۔"

"پانی۔"

"پانی ؟"

"پانی —— پانی۔"

"مبارک ہو —— ہوش آ رہا ہے۔"

"خدایا تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔"

لوہے کا آدمی

چلتے چلتے اچانک اس پر نظر پڑتی ہے۔ مَیں اسے فوراً پہچان لیتا ہوں۔

"ارے واہ ـــــ تم یہاں۔" مَیں خوشی اور حیرت سے کہتا ہوں۔

وہ کوئی جواب نہیں دیتا ـــــ دے بھی نہیں سکتا۔ برسوں بعد اسے اچانک دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے جیسے پردیس میں کوئی بچھڑا ہوا عزیز مل گیا ہو۔

مَیں کل شام سے اس شہر کی سڑکوں پر مارا مارا پھر رہا ہوں۔ کل دیر سے ایئرپورٹ پہنچنے کی وجہ سے میری فلائیٹ نکل گئی۔ میرا کوئی یہاں جاننے والا نہیں ہے۔ مَیں نے وقت گزارنے کے لیے شہر کی تقریباً سب اہم جگہیں دیکھ ڈالی ہیں۔ لیکن میری اگلی فلائیٹ میں اَب بھی اٹھارہ گھنٹے باقی ہیں۔

اس وقت مَیں بڑے بازار کا چکر لگا کر واپس ہوٹل کی طرف جا رہا تھا کہ ایک چھوٹے سے ریستوران کے سامنے میری اس پر نظر پڑی ہے اور مَیں نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا ہے کیسے نہ پہچانتا، میرا اس کا بارہ برس تک ساتھ رہا ہے۔ پھر ایک بار مجھے کچھ رقم کی ضرورت پڑ گئی اور میں نے اسے اپنے شہر کے ایک ڈیلر کے ہاتھ فروخت کر دیا اور بھول گیا۔ لیکن اَب تین چار برس بعد اسے اچانک یہاں دیکھ کر مجھے لگ رہا ہے جیسے مَیں خود اسے یہاں

کھڑا کر کے تھوڑی دیر کے لیے اِدھر اُدھر چلا گیا تھا۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں اس خوشی کا اظہار کیسے اور کس سے کروں جو اسے اس اجنبی شہر میں دیکھ کر مجھے ہو رہی ہے۔ اس کا موجودہ مالک یقیناً اندر بیٹھا چائے پی رہا ہو گا۔ وہ کسی وقت بھی باہر آ سکتا اور اُسے وہاں سے لے جا سکتا ہے۔ مَیں یہ سوچ کر اداس ہو جاتا ہوں کہ پتہ نہیں کب ہماری اس ملاقات کا وقت ختم ہو جائے۔

مَیں آگے بڑھ کر اُسے چھوتا ہوں اور میرے اپنے بدن میں سنسنی سی دوڑ جاتی ہے۔ مَیں فرطِ محبت میں اس پر ہاتھ پھیرتا ہوں اور مجھے یوں لگتا ہے جیسے اس کے کان کھڑے ہو گئے ہوں اور وہ اندر ہی اندر زور زور سے ہنہنانے لگا ہو۔

کلچ کافی سخت ہو رہا ہے شاید اُسے گریس کی ضرورت ہے۔ سٹینڈ میں بھی کچھ نقص معلوم ہوتا ہے کیونکہ وہ ایک طرف کو جھکا کھڑا ہے۔ کافی جگہوں سے روغن اُکھڑا ہوا ہے۔ ہینڈل پر وہ ڈنٹ صاف نظر آتا ہے جو ایک بار کھمبے سے ٹکرانے کی وجہ سے پڑا تھا۔ پھر بھی اس کی مجموعی حالت زیادہ خراب نہیں ہے۔ لیکن اگر اس کے اندر پہیوں کی بجائے لہو گردش کرتا ہوتا تو وہ میری حالت دیکھ کر ضرور رو پڑتا۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ مجھ سے بہت سے سوالات بھی پوچھتا۔ بچھڑ جانے والوں کا حال احوال دریافت کرتا۔ وہ ان حادثوں کی تفصیل بھی جاننا چاہتا جنہوں نے میرے اندر باہر ڈنٹ ڈال دیے ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو مَیں بھی اس سے وہ سب کچھ کہتا جو کسی سے نہیں کہہ سکتا ہوں مگر وہ کچھ نہیں پوچھتا وہ مجھے دیکھ کر ہنسا ہے نہ رویا ہے اور نہ ہی اس کے کسی حصے میں کوئی جنبش ہوئی ہے۔

مجھے وہ دن یاد آتا ہے جب میں اسے خرید کر لایا اور اس پر پہلی بار سوار ہوا تھا۔ مجھے لگا تھا جیسے میرے پَر نکل آئے ہوں۔ کئی برسوں پہلے، روزانہ گھر سے سکول تک کا بارہ میل کا فاصلہ پیدل چلتے چلتے جب مجھے پھٹیچر سی بائیسکل ملی تھی تب بھی ایسا ہی لگا تھا مگر بائیسکل نئی ہو یا پرانی چلنے کے لیے انسانی خون کا ایندھن مانگتی ہے۔ برسوں تک پیڈل

مار مار کر میری ٹانگوں کا خون خشک ہو گیا اور نجانے کتنے ہی بعد میں روانہ ہونے والے مجھ سے آگے نکل گئے۔

مجھے یاد آتا ہے۔ اسے خریدنے کے لیے مجھے کتنی محنت اور انتظار کرنا پڑا تھا۔ پہلی تنخواہ ہی سے میں نے اس کے لیے پیسے بچانا شروع کر دیے تھے اور کئی برسوں کا اوور ٹائم ملا کر اس تک پہنچ سکا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا ہوا تھا کہ نیا ہی خریدوں گا۔ آدمی کے پاس کوئی چیز تو نئی بھی ہونی چاہیے۔ مجھے زندگی میں ہر چیز پرانی اور سیکنڈ ہینڈ ملی تھی۔ بڑے بھائیوں کے چھوٹے پڑ جانے والے کوٹ سویٹر اور کپڑے۔ ان کے گھسے ہوئے تلووں والے جوتے۔ ان کی پڑھ پڑھ کر پھاڑی اور میلی کی ہوئی کتابیں۔ چھوٹا ہونے کے ناتے میرے لیے بازار سے بھی پرانی اور سیکنڈ ہینڈ چیزیں خریدی جاتیں۔ نئی اور تازہ چیزوں کے لیے میں ہمیشہ سے ترسا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ مجھے جو محبت ملی وہ بھی فرسٹ ہینڈ نہیں تھی۔ لیکن اُسے دیکھ کر میرے اندر کوئی کان پر ہاتھ رکھ کر اُونچے سروں میں مرزا صاحباں گانے لگتا تھا۔ ؎

دھی کھیوے دی صاحباں جس تے حُوراں گھنڈ کڈھن
اوہدے پٹ چنن دیاں گیلیاں کھہہ کھہہ مُشک چھڈن
اوہدے خونی نین پکھا ولے بازاں وانگ تکن
اوہ پاڑن وَل وَل دلاں نُوں بگیں رَت پیون
اوہدے سر تے بھوچھن کاہڈھواں وچ تلیئر چوگ چگن

وہ بچپن ہی سے اپنے تایا زاد سے منسوب تھی اور اس کے لیے کتابوں رسالوں سے اشعار چُنتی اور اسے بھجواتی رہتی تھی اور وہ ہر صبح اس کے سرہانے بہت سے پھول اور کلیاں ڈال جایا کرتا تھا۔ لیکن پھر دونوں گھروں کے درمیان جائیداد کا جھگڑا شروع ہوا اور آئے دن گالی گلوچ کی آندھیاں اور طعنوں مہنوں کے جھکڑ چلنے لگے۔ چہروں پر نفرتوں اور کدورتوں کی گرد جمنے لگی اور دل محبتوں سے خالی ہونے لگے۔ ایسے ہی خزاں کے کسی موسم

میں جب اس کے دل کا شجر بے برگ و بار ہو رہا تھا۔ اس نے کسی اجنبی پرندے کی چہکار سُنی۔ وہ اُسے بار بار اُڑاتی مگر وہ لوٹ لوٹ کر آجاتا اور ننگی ٹہنیوں پر بیٹھ کر چہچہانے لگتا۔ قریب رہنے والی چیزوں سے اُنس ہو ہی جاتا ہے وہ اُسے دانہ دُنکا ڈالنے لگی۔

مجھے یاد آتا ہے۔

جب میں اچانک بریک لگاتا تھا۔ وہ ایک جھٹکے کے ساتھ، میرے ساتھ آلگتی تھی اور میری زرہ بکتر کا لوہا پگھلنے لگتا تھا۔ ہر دوسرے تیسرے مہینے بریک شُوز بدلوانا پڑ جاتے تھے۔

مَیں چونک پڑتا ہوں۔

ریستوران سے نکل کر ایک دُبلا پتلا آدمی اس طرف کو آرہا ہے۔ شاید اس سے بھڑنے کی گھڑی قریب آگئی ہے۔ مَیں ایک طرف کو ہٹ جاتا ہوں مگر وہ اس کی طرف دیکھے بغیر آگے بڑھ جاتا ہے۔ مجھے بے حد خوشی ہوتی ہے کہ کچھ دیر اور اس کے ساتھ گزار سکوں گا۔ بھولی بسری باتوں کو یاد کر سکوں گا۔ بعض زخم ایسے ہوتے ہیں کہ آدمی اُنہیں کھُرچ کر خوش ہوتا ہے۔

ایک بار میرا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر مجھے ہوش میں لانے کی سر توڑ کوشش کر رہے تھے مگر ہوش نہیں آرہا تھا۔ پھر مَیں نے ایک بوڑھی اور نحیف آواز سُنی۔ اپنی ماں کی۔ پتہ نہیں کیسے بے ہوشی کے تنے ہوئے تنبو کو پھاڑ کر اس کی سسکی کی لاغر سی آواز میرے اندر گھس گئی تھی اور مَیں نے آنکھیں کھول دی تھیں۔

مجھے وہ دن یاد آتا ہے جب ہم لمبی سیر سے لوٹے تھے۔ گھر کے قریب پہنچ کر اس نے کہا تھا۔

"یہ گھر اتنی جلدی کیسے آگیا ہے؟"

"کہو تو واپس چلیں؟"

"ہاں چلو۔"

اور ہم واپس چلے گئے تھے۔

ایک دفعہ وہ صبح کی گاڑی سے ننھیال جا رہی تھی۔ اُس نے مجھے اسٹیشن پر آنے کو کہا تھا۔ لیکن میں ناراض تھا۔ دو روز پہلے ہماری کسی بات پر چھوٹی سی لڑائی ہو گئی تھی۔ میں اتنی جلدی من جانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ مجھے یہ سوچ کر خوشی ہو رہی تھی کہ وہ بار بار خالی پلیٹ فارم کو دیکھ کر پریشان ہوتی ہو گی۔ وہ مجھے لوہے کا آدمی کہتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ تھوڑی سی عمر میں بہت ساری صعوبتیں برداشت کر کے میری کھال ہی نہیں دل بھی سخت ہو گیا تھا۔ وہ بہت جلد غصّے میں آجاتی لیکن پھر فوراً ہی من جاتی تھی۔ مجھے غصہ نہیں آتا تھا مگر دل میں بدگمانی یا ناراضی کی ذرا سی خراش بھی پڑ جاتی تو اُسے مٹانے کے لیے مجھے کئی کئی دن کی مہلت درکار ہوتی۔ وہ معمولی معمولی باتوں پر خوش ہو جاتی تھی اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر رو پڑتی تھی۔ وہ ناول یا افسانہ پڑھ کر اور فلم کا المیہ سین دیکھ کر رو پڑتی تھی۔ اس کے برعکس مجھے کبھی کسی بڑے سے بڑے حادثے پر بھی رونا نہیں آیا تھا۔ وہ کہا کرتی تھی۔

"رونے والی بات پر رو پڑا کرو، اس سے دل کا میل دُھل جاتا ہے۔"

میں کوشش کرتا مگر مجھے رونا نہ آتا۔ ہنسی بھی نہ آتی۔ ہاں اکثر خوف آتا رہتا ـــــ اپنے آپ سے۔

مَیں اسٹیشن نہیں جانا چاہتا تھا۔ دل میں ایک آدھ سلوٹ ابھی باقی تھی۔ لیکن پھر پتہ نہیں کیا ہوا جب گاڑی چلنے کا وقت قریب آیا میرے اندر ایک انجن سا زور زور سے بھاپ نکالنے لگا۔ اگر اس روز کوئی میرے اسٹیشن پہنچنے کی وِڈیو ریکارڈنگ کر رہا ہوتا تو اتنا طویل فاصلہ اتنے کم وقت میں طے کرنے پر مجھے کوئی بڑا عالمی ایوارڈ دیا جاتا یا پھر تیز رفتاری اور ٹریفک اصولوں کی خلاف ورزی کے جرم میں میرا لائسنس ضبط کر لیا جاتا۔ یوں لگتا تھا میں اسٹیشن نہیں نیلی پر سوار ہو کر دانا باد جا رہا تھا۔

اوہدیاں قلماں وانگ کنوتیاں اُتّے سُوہے سبز پلان
اوہدے سنباں لاٹاں چھڈیاں جیوُں آہرن پَین ودان

بعد میں اس نے خود ہی بتایا تھا کہ وہ مجھ سے بہت مایوس ہو چکی تھی اور اگر میں اس روز اسٹیشن نہ جاتا تو اس نے میرے لوہے کا آدمی ہونے پر پکّی مُہر لگا دینا تھی اور عین ممکن تھا کہ وہ میری سیکنڈ ہینڈ محبت کو اپنے ننھیال میں کوڑیوں کے بھاؤ بیچ آتی۔

مجھے یاد آتا ہے۔

سہ پہر کی سنہری دھوپ چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ کہنے لگی۔

"کیا تمہیں بہت جلدی ہے؟"

"نہیں تو۔"

"پھر آہستہ کیوں نہیں چلاتے؟"

"کیا تمہیں ڈر لگتا ہے؟"

"ہاں —— اس بات سے کہ یہ سفر جلد ختم ہو جائے گا۔"

"اچھا تمہارا مطلب ہے . . . . "

"میرا کچھ بھی مطلب نہیں۔" وہ جل کر بولی۔ "بس تم اُڑ کر پہنچ جاؤ۔"

"بھئی چڑھائی جو ہے آہستہ چلاؤں گا تو کیسے چڑھیں گے۔"

"میرا تو جی چاہ رہا ہے وقت تھم جائے بس ہم اسی طرح . . . ." اس نے سر میرے کندھے سے ٹکا دیا اور کہنے لگی۔ "یہ جو سامنے بلند اور مٹیالا پہاڑ ایستادہ ہے اسے یاد رکھنا۔"

"کیوں اس کے اندر کوئی خزانہ چھُپا ہوا ہے؟"

"ہاں —— اسے یاد رکھنا۔ اس کی استقامت کو یاد رکھنا۔"

پھر وہ بلند آواز میں پکاری۔

"پہاڑ —— تو گواہ رہنا۔"

اسکی آواز چٹانوں سے ٹکرائی، لوٹ کر آئی پھر منظر کا حصّہ بن گئی۔ مجھے محسوس ہوا وہ بہت جذباتی ہو رہی تھی۔ اس میں یہ بڑی خرابی تھی۔ وہ بادل کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا دیکھ کر رومینٹک ہو سکتی اور محض اداسی کا خیال کر کے اداس ہو سکتی تھی۔

اگلے موڑ پر اس نے رُکنے کی فرمائش کی۔ مَیں رُک گیا اور ایک طرف کھڑے ہو کر ٹوکری سے پھل نکال کر کھانے لگا وہ بولی۔

"ایک تو تم پیٹو بہت ہو ہر وقت کھانے پینے کی فکر میں رہتے ہو خدا کے بندے اُدھر سامنے تو دیکھو۔"

"کیا ہے اُدھر؟" میں نے جھنجھلا کر کہا۔ "بادل ہیں پہاڑ ہے سبزہ اور جنگل ہے۔ سب کچھ ویسا ہی تو ہے جیسا ہونا چاہیے۔"

"اور وہ نیچے بہتی ندی اور وہ۔" وہ رُک گئی پھر بولی۔ "یہ تم میری طرف کیا دیکھ رہے ہو؟"

"سچ پوچھو تو مجھے اس وقت بھی تمہارے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا میرے لیے ان سب مناظر کی اگر کوئی اہمیت ہے تو بس یہ کہ تم ان کے درمیان موجود ہو۔"

"افوہ بھئی مَیں کہیں بھاگی تو نہیں جا رہی جو تم ندیدوں کی طرح مجھے ہی گھُورے جا رہے ہو۔"

"مَیں نے سُنا ہے تمہارے گھروں میں صلح ہو گئی ہے؟"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"پڑ سکتا ہے۔"

"نہیں۔"

"سچ؟"

"ہاں۔"

مَیں چونکتا ہوں۔

ادھیڑ عمر کا بھاری جسم والا ایک شخص قریب کھڑا مجھے شک بھری نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ مَیں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ لیکن وہ اس کا موقع نہیں دیتا۔ چابی گھما کر ہینڈل سیدھا کرتا اور کِک لگاتا ہے اور مجھے عجیب نظروں سے دیکھتا ہوا ایک طرف کو چلا جاتا ہے۔

میرا دل کسی انجانی زنجیر میں بندھا کھنچتا چلا جاتا ہے۔ شام کے ملگجے اندھیرے میں اس کی سُرخ بتّی دکھائی دیتی رہتی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ نظروں سے اُوجھل ہو جاتی ہے۔

میرے اندر بہت سی چھوٹی بڑی گراریاں چلنے لگتی ہیں۔ مَیں خود پر قابو پانے کی بہت کوشش کرتا ہوں۔ لیکن آدمی آخر آدمی ہوتا ہے۔ چاہے لوہے کا ہو۔ اس کے اندر پٹرول نہیں لہو چلتا ہے۔ میری آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ عجیب خفّت سی محسوس ہوتی ہے۔ لیکن پھر مجھے یاد آتا ہے کہ رونے والی بات پر رو لینا چاہیے اس سے دل کا میل دُھل جاتا ہے اور مَیں کہ کبھی نہیں رویا تھا پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگتا ہوں۔

سارنگی

میرے اندر کھلبلی سی مچ گئی۔

عمر کے اس حصے میں جب لطیف اور نازک جذبے سرد پڑ جاتے ہیں اور آدمی کے اندر کا بیل تھک کر تھان پر بیٹھا جگالی کر رہا ہوتا ہے۔ اسے ڈچکروں اور ٹھوکروں سے حرکت میں نہیں لایا جا سکتا۔ اسے ہلانے جلانے کے لیے تابڑ توڑ ڈنڈے برسانا پڑتے ہیں۔

اس کی موت کی خبر سن کر مجھے صدمہ ضرور ہوا جیسے بیٹھے بٹھائے اچانک کسی نے ٹھوکر ماردی ہو۔ میں چونکا اور پلٹ کر دیکھنا چاہا مگر میرے سینگوں پر دھرتی کا بوجھ تھا۔ لیکن جب مجھے معلوم ہوا کہ اس نے آخری روز سارنگی سننے کی خواہش کی تھی تو میرے اندر کوئی چیز زور سے اچھلی۔ ٹھہرے ہوئے پانی میں حرکت ہوئی اور برسوں سے رُکا ہوا رہٹ سا چلنے لگا۔

آرٹا نگاں پار ٹانگاں وِچ ٹل مٹیاں
اوہن کونجاں دیہن بچے ندی نہاون چلیاں

مَیں نے تھوڑی دیر کے لیے دھرتی کو سینگوں سے اُتار کر رکھا اور گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ پیچھے —— دور تک —— گئے دنوں کا غبار پھیلا ہوا تھا۔

اس غبار میں بہت سی چیزیں چھپ گئی تھیں۔ بہت کچھ دھندلا گیا تھا۔ مگر بہت سی چیزیں اور چہرے اب تک صاف نظر آتے تھے ـــــ آہستہ آہستہ میری سماعت کا رنگ بھی اُترنے لگا اور مجھے بھولی بسری آوازیں سنائی دینے لگیں۔

مچھروں کی گھوکریں، جھینگروں کا شور اور مینڈکوں کے ٹرّانے کی آوازیں۔ اور ان سب آوازوں پر اوور لیپ ہوتی ڈھولک کی تھاپ اور گانے کی کچی پکی آوازیں، جیسے ریشم سُوت اور سٹیل وول کے تار آپس میں اُلجھ گئے ہوں۔

ہر رات ایک جیسے گیت گائے اور دھرائے جاتے کبھی کبھی ڈھولک بجانے والی تھک کر بھٹک جاتی تو سب کچھ بے سرا ہو جاتا۔ لگتا ریل گاڑی پٹڑی سے اُتر گئی ہے۔

لیکن پھر چند ہی روز میں مَیں اُن اَن گنت آوازوں کے شور میں سے ایک ایسی کومل آواز دریافت کرنے میں کامیاب ہو گیا جیسی ساون اور اساڑھ کے مہینوں میں آم کے پیڑوں سے سُنائی دیتی ہے۔ اس خوشبو آواز کو بھانت بھانت کی آوازوں سے الگ کرنا آسان کام نہ تھا۔ مَیں نے زرگر کی دکان کا کوڑا کرکٹ خریدنے والوں کو تالاب کے کنارے نتھار نتھار کر سونے کے باریک ذرات تلاش کرتے دیکھا تھا۔ لیکن خود اس قسم کے کسی تجربے سے نہیں گزرا تھا۔ مجھے لگتا بار بار مجھ سے کوئی قیمتی نگینہ ریت کے انبار میں کھو جاتا ہے اور مجھے ہر بار نئے سرے سے ساری ریت چھاننا پڑ جاتی ہے۔

مَیں سماعت کی چھاننی سے ریت کے انبار چھان کر ہلکان ہو جاتا تب کہیں آوازوں کے درمیان یا آخر میں اس جان لیوا آواز کا ہلکا سا جھونکا آتا اور مجھے کپکپا دیتا۔

اندر باہر کوئلیں کوکنے اور وائلنیں بجنے لگتیں۔

مجھے وائلن کی آواز بہت اچھی لگتی تھی۔ اتنی اچھی کہ لگتا مجھے سماعت محض اسی کے لیے تفویض ہوئی ہے۔

وہ سب خوشی اور مسرت کے گیت ہوتے ان کی طرزیں اور بول طربیہ ہوتے مگر

اس آواز میں عجیب طرح کا حزن اور سوز تھا جیسے کوئی کوک پکار رہا ہو جیسے کہیں سے ہوک اُٹھ رہی ہو مجھے اس اداس کر دینے والی آواز میں اتنی اپنائیت محسوس ہوتی کہ لگتا یہ آواز میری ہی تلاش میں کرلاتی پھرتی ہے۔ پھر وہ آواز حسن کے ایک پیکر میں ڈھل جاتی۔ مَیں آواز کے ریشم کا تار پکڑ کر اس پیکر تک پہنچنے کی سعی کرتا مگر ہر بار تار ٹوٹ جاتا اور مَیں گر کر چکنا چُور ہو جاتا۔

گھر کی سب سے اونچی چھت پر لیٹے لیٹے میرے چاروں طرف اضطراب کا جنگل پھیل جاتا۔ درد کے بلند پیڑوں اور دُکھوں کی جھاڑیوں کے درمیان رات بھر میں آواز کے کوندوں سے لکن میٹی کھیلتا۔ اس کی ایک تان مجھے زمین سے اُٹھا کر آسمان کی بلندی پر پہنچا دیتی۔ لگتا قوس قزح کی پینگ کا لمبا ہلارا آیا ہے ـــــ بھوں سے چڑھ جاتے۔

مَیں نے اس آواز کے ساتھ اتنی پٹخنیاں کھائیں کہ مجھے سب کچھ بھول گیا۔ دوستوں کی صحبتیں، رقص و موسیقی کی محفلیں، ریستورانوں کے کیبنوں میں بیٹھ کر کی گئی سرگوشیاں اور عہد و پیمان۔

وہ آواز گھنگھور گھٹا بن کر میرے دل کی فضا پر محیط ہو گئی۔ اس نے میرے سکون کے تو نبے کر دیے۔ میری بے فکری اور فراغت کی جوان جہان نیندوں کے پرزے بکھیر دیے۔ مَیں رات بھر جاگتا اور دن بھر اونگھتا اور سنسان دوپہروں میں بچھڑی ہوئی آواز کے جگنو تلاش کرتا۔

کئی بار جی میں آیا کسی سے اس کا نام پوچھا جائے مگر کس کا؟ کیا پتہ دوسروں کو سب آوازیں اچھی اور ایک جیسی لگتی ہوں۔

مَیں گاؤں میں اجنبیوں کی طرح تھا۔ میرا زیادہ تر وقت شہر میں گزرا تھا۔ پھر بھی میں بہت سے چہروں سے آشنا تھا۔ مگر میں ہر چہرے کو دیکھ کر وثوق سے نہیں بتا سکتا تھا کہ اس کا نام کیا ہے۔ ایسی صورت میں آواز سے نام اور چہرہ دریافت کرنا تقریباً

ناممکن نظر آتا تھا۔

ایک روز وہ لڑکی جس کی شادی ہو رہی تھی ہمارے ہاں آئی سوچا اسی سے پوچھ لوں مگر وہ مجھ سے بہت شرماتی تھی۔ میں بات کرنے کی کوشش کرتا تو وہ سُرخ ہو جاتی، چپ رہتی یا بھاگ جاتی۔

شروع میں میرا خیال تھا کہ اس کا بیاہ ہو رہا ہے۔ اس لیے وہ خود نہیں گاتی ہو گی لیکن پھر پتہ چلا کہ اس کے بھائی کا بیاہ بھی ایک ساتھ ہو رہا ہے اس لیے وہ گانے والیوں میں پیش پیش ہے۔ میں نے کھوج لگانے کی کوشش کی تو معلوم ہوا، اس کی آواز اچھی ہے اور اسے سب سے زیادہ گیت یاد ہیں۔ خیال ہوا کہیں وہ —— وہی تو نہیں مگر ٹھیک سے کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔

ایک روز وہ بھائی کی ہونے والی دلہن کے لیے خریدے گئے ملبوسات اور زیور دکھانے آئی تو اس نے امی کو اس طرح گنگنا کر دور سے پکارا کہ میرے اندر توپ سی دغی —— بدن میں خون تیزی سے گردش کرنے لگا۔ اس کی خوبصورتی میں آواز کا حُسن جمع کرنے کے بعد اعداد و شمار میرے بس سے باہر ہو گئے۔ اس روز وہ مجھ سے صرف چند قدم کے فاصلے پر کافی دیر تک موجود رہی اور شاید منتظر بھی تھی کہ میں اس سے بات کروں مگر مجھ سے بولا نہ گیا یہی خوف رہا کہ کہیں لفظوں کی بجائے کلیجہ باہر نہ آجائے۔

ایک روز سارنگی کے ساتھ گا کر مانگنے والا دو لو فقیر دروازے پر آیا۔ میں نے سارنگی کی آواز پہلے بھی سنی تھی مگر گھاؤ تازہ ہونے کی وجہ سے لگتا تھا۔ پہلی بار سُن اور سہہ رہا ہوں۔ میں نے اسے اندر بلا لیا اور اپنے پاس بٹھا کر صرف سارنگی سنانے کی فرمائش کی۔

دو لو نوجوان تھا لیکن اسے سارنگی بجانے میں استادانہ مہارت تھی —— مجھے وائلن کی آواز مضطرب کر دیا کرتی تھی۔ لیکن آج اس کی سارنگی کی آواز نے مجھے وارفتہ کر دیا۔ عین اس وقت جب سارنگی کی آواز میرے جسم کے آر پار ہو رہی تھی۔ باہر کا دروازہ

کھلا اور وہ چادر اوڑھے اندر آئی ـــــ یک نہ شد دو شد ـــــ میرا اندر باہر چلنی ہو گیا۔
امّی پسار میں تھیں وہ سیدھی اندر چلی گئی کچھ دیر پسار میں گم رہی پھر خلاف توقع برآمدے کے دوسرے سرے پر کونے میں بیٹھ گئی اور آنکھوں کے سوا چادر میں خود کو لپیٹے سارنگی سننے لگی۔

سارنگی سرگوشیاں کرتی کبھی سسکتی، کبھی رو کر پکارتی۔

سارے گھر میں کوئلیں کوکنے لگیں۔ فاختائیں گھگھو گھوہ الاپنے لگیں۔ پپیہے بولنے لگے۔
چاروں طرف ڈھولوں کی گھمکاریں سُنائی دینے لگیں۔

؎ تیرے حسن دے ڈھولاں دی بمب بولے دھراہ دھراہ او دلبرا واسطہ ای

میرے اندر کوئی فراقیہ چٹھیاں لکھنے لگا۔

سارنگی وہ چٹھیاں ساتھ ساتھ مکتوب الیہ تک پہنچاتی رہی۔

درد کا دریا چڑھتا گیا اور ہر طرف جل تھل ہو گیا ـــــ آہستہ آہستہ روحوں پر چڑھے غلاف اُترنے لگے اور اچانک اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔
پھر لگا کہ ضبط اور احتیاط کا دامن اس کے ہاتھ سے چھوٹ جائے گا اور وہ سارنگی سے بھی اونچی آواز میں رونے لگے گی معاً وہ اُٹھی اور بچے کھچے آنسوؤں سمیت باہر نکل گئی۔

یہ میری اس سے پہلی اور آخری ملاقات تھی۔

اگلے روز وہ مایوں بیٹھ گئی۔

تیل مہندی ـــــ گھڑا گھڑولی ـــــ شہنائی ـــــ برات اور رخصتی۔

جس روز اس کی ڈولی نکلی میں گھر پر اکیلا تھا۔ امی دن بھر شادی والے گھر میں رہیں اور میں برآمدے میں لیٹا یادوں کے ریکارڈ پلیئر پر سارنگی سنتا رہا۔

پھر مجھے نیند آگئی۔

لمبی اور گہری نیند۔

جب میری آنکھ کھلی پچیس سال بیت گئے تھے۔
وہ جو اسے رخصت کرنے گئی تھی خود بھی رخصت ہو چکی تھی۔
اس گھر میں اَب دوسرے لوگ رہتے تھے۔

بہت کچھ اتھل پتھل ہو چکا تھا۔ بہت سے لوگ بچھڑ گئے تھے۔ بہت سے نئے لوگ آ ملے تھے۔ کچھ عرصہ تک مجھے سارنگی کی آواز اچھی لگتی رہی۔ پھر اس کی جگہ دوبارہ وائلن نے لے لی۔ پھر میرے ذوق میں اور وسعت آئی اور مجھے پیانو اور الیکٹرک گیٹار کی آوازیں بھی اچھی لگنے لگیں اور میں سارنگی کو بالکل بھول گیا۔ لیکن مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ سارنگی کو کبھی نہیں بھولی تھی۔ یقیناً اُسے وہ سب چھٹیاں بھی زبانی یاد ہوں گی جو اس نے سارنگی کی زبان سے سُنی تھیں۔

میرا جی چاہتا کوئی مجھے اس کے بارے میں بہت کچھ بتائے۔ وہ کیسے رہتی تھی۔ کیا سوچتی تھی۔ سارنگی کی آواز سن کر اس پر کیا بیتتی تھی۔ لیکن کوئی تفصیل سے نہیں بتاتا تھا۔ اتنا سب کو معلوم تھا اسے سارنگی کی آواز پسند تھی اور جب بھی سارنگی بجاتا کوئی فقیر دروازے پر آتا وہ لپک کر دروازے پر آجاتی اور اوٹ میں کھڑی دیر تک سارنگی کی آواز سنتی رہتی۔ ان خوش قسمت بھکاریوں میں دولو بھی شامل تھا جو دوسرے تیسرے مہینے اس کے گاؤں خیرات لینے اور سارنگی سُنانے جاتا تھا۔

اس کی موت کی خبر سن کر میرے اندر عجیب سی خواہش مچلنے لگی۔

آدمی کو زندہ رہنے کے لیے خواہشوں کے کیسے عجیب و غریب منطقوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ وہی باتیں جو عمر کے ایک حصّے میں آدمی اپنے قریبی دوستوں سے بھی چھپاتا ہے عمر کے ایک خاص دور میں پہنچ کر جب جذباتی دلچسپیوں اور وابستگیوں کے تمام دروازے ایک ایک کر کے اس پر بند ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس کا جی چاہتا ہے گزرے ہوئے دنوں کی جذباتی وابستگیوں کے افسانے ہر کسی کو سنائے۔ شاید عمر کے اس حصّے میں

جذباتی حوالے سے آدمی کے پاس خود پر ناز کرنے کی اور کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔

میرا جی چاہتا سب کو پتہ چل جائے اسے سارنگی کیوں پسند تھی۔ لوگوں میں چرچے ہوں۔ گھر گھر اس بات کے تذکرے ہوں۔ میری خاطر اس کے اندر ہی اندر سلگنے اور گھل گھل کر مر جانے کی داستان اخباروں میں چھپے۔ نظمیں اور کہانیاں لکھی جائیں۔ نوجوان مجھ پر رشک کریں۔ میں جدھر سے گزروں لوگ مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھیں اور آپس میں سرگوشیاں کریں۔

یہی خواہش مجھے کھینچ کر گاؤں لے گئی اور میں نے اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنا شروع کیں۔ ددلو کو اس کے احوال کا بہت کچھ پتہ ہوگا۔ اس خیال سے میں نے اگلے روز اسے بلوایا۔ ددلو کے سر اور داڑھی کے بال ہی نہیں بھنویں تک سفید ہو چکی تھیں۔ اسے دیکھ کر مجھے اپنے بڑھاپے کا احساس شدید ہو گیا۔ اس کے ہاتھ کانپتے تھے اور جسم ناتوانی کے سبب نہایت کمزور ہو چکا تھا۔ اس نے مجھے بتایا۔

"جی میں دوسرے تیسرے مہینے اس طرف کا پھیرا ضرور لگاتا تھا۔ بڑی نیک اور سخی عورت تھیں —— میں جب کبھی اس طرف جاتا سیدھا ان کے دروازے پر جا کر سارنگی بجانے لگتا۔ فوراً آ جاتیں۔ آہٹ سے پتہ چلتا آ گئی ہیں۔ آخری روز بھی سارنگی سننے کی خواہش کی۔ چودھری نے میرے پیچھے آدمی بھی دوڑایا۔ مگر جی میں قسمت کا مارا دریا پار گیا ہوا تھا۔ مجھے پتہ ہی نہ چلا اوپر سے بے وقوفی ہو گئی جی —— تیسرے چوتھے روز واپس آیا تو سیدھا دروازے پر جا کر سارنگی بجانے لگا اندر سے آواز آئی۔ کہیں اور جا کر بجاؤ بابا۔ یہ ماتم والا گھر ہے —— میرے تو جی ہوش اُڑ گئے۔"

اس کی آواز بھرا سی گئی۔ میں نے ازراہِ تجسس پوچھا۔

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ اسے سارنگی کیوں پسند تھی؟"

"کوئی دُکھ تھا جی ان کے دل میں —— اندر ہی اندر۔"

"کیا دُکھ تھا ـــــ تم اتنے برس آتے جاتے رہے کبھی اندازہ ہوا ؟"

"اندازہ ؟" دولو رونے کے انداز میں ہنسا۔ پھر کہنے لگا۔ "یاد ہے آپ کو جب ان کی شادی ہو رہی تھی ۔"

"ہاں یاد ہے" ـــــ میرا دل دھڑکنے لگا ـــــ دولو نے کہاں ہاتھ ڈال دیا تھا۔

"اس روز میں اتفاقاً آپ کو نہیں مل گیا تھا سارنگی سُنانے ۔"

"کیا مطلب ؟"

"میری تو زبان سارنگی ہی تھی جی ۔"

"تمہاری زبان ـــــ سارنگی ؟"

"چھوڑیئے میاں صاحب ـــــ اَب کیا فائدہ ان باتوں کا ۔"

"مجھے بتاؤ دولو ـــــ تم کیا کہہ رہے تھے ؟"

"بہشتن نے منع کیا تھا جی ـــــ ویسے بھی کیا فائدہ ۔"

"فائدے نقصان کو چھوڑو ـــــ یہ بتاؤ سارنگی اسے کیوں پسند تھی ـــــ"

"وہ جی ہر دُکھی دل والے کو پسند ہوتی ہے ـــــ وہ تو جی دُکھی رُوح لے کر دُنیا میں آئی تھیں ـــــ بچپن ہی سے انہیں سارنگی کی آواز اچھی لگتی تھی۔ پھر انہیں دیکھ کر میرے ہاتھوں میں درد زیادہ آجاتا تھا ـــــ بس جی میں زندگی بھر بجاتا رہا وہ سُنتی رہیں ـــــ نہ انہوں نے کبھی کچھ کہا نہ میں نے ـــــ صرف ایک بار کہنے لگیں۔ !

"دولو تم خوش قسمت ہو تمہارے حصّے کا رونا سارنگی رو دیتی ہے اور یہ سارنگی مجھ سے بہتر ہے کہ اپنا احوال تو کہہ سکتی ہے۔"

دولو نے اور بھی بہت کچھ کہا شاید اسے زندگی میں پہلی بار اس کا موقع ملا تھا لیکن

مجھے اَب کچھ سُنائی نہیں دے رہا تھا ـــــ آوازیں آہستہ آہستہ دور ہوتی جا رہی تھیں اور چیزیں اور چہرے ماضی کی دھول میں چھپتے جا رہے تھے۔ آہستہ آہستہ اس غبار میں سب کچھ چھپ گیا۔ اور میرے پاس یادوں کی جگالی کرنے کے لیے بھی کچھ نہ بچا ـــــ ہاں اتنا ضرور ہے کہ دروازے پر کبھی کوئی بھولا بھٹکا سارنگی بجاتا فقیر آنکلتا ہے تو مَیں اوٹ میں کھڑے ہو کر دیر تک سنتا رہتا ہوں۔

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے
ہیں مزید اس طرح کی شان دار،
مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے
ہمارے وٹس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پینل

عبداللہ عتیق : 03478848884

سدرہ طاہر : 03340120123

حسنین سیالوی : 03056406067

گیارھواں میل

"آخر بات کیا ہوئی تھی انہوں نے پہلے تو کبھی ایسا نہیں کیا ؟"

"بس یار کیا بتاؤں بڑی معمولی بات تھی مگر کچھ عجیب سی ۔"

"مجھے پوری بات بتاؤ ۔"

"پہلے تمہارے لیے چائے نہ بنا لاؤں ؟"

"گولی مارو چائے کو ـــــ یہ کوئی چائے پینے کا موقع ہے مجھے تو سونا گھر دیکھ کر وحشت ہو رہی ہے ۔"

"مگر یہ تو لمبا قصہ ہے ۔"

"اوہو تم شروع کرو گے تو ختم ہو گا نا !"

"اچھا سنو ـــــــ یہ تو تمہیں پتہ ہی ہے کہ میں ضعیف العقیدہ آدمی نہیں ہوں ۔"

"جی ہاں مجھے معلوم ہے آپ نے طبیعات میں ایم ایس سی کیا ہے ۔"

"یار میرا مطلب یہ نہ تھا۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ میں غیر عقلی اور فوق الفطری باتوں کو اہمیت نہیں دیتا ۔"

"اچھا تو بھابھی نے کوئی غیر سائنٹفک بات کہہ دی ؟"

"تم سُنو تو ـــــ میں کہہ رہا تھا کہ اگرچہ میں ایسی باتوں کو نہیں مانتا مگر زندگی میں بعض واقعات پیش آتے ہیں کہ آدمی ان کی کوئی منطقی یا سائنسی توجیح نہیں کر سکتا۔ یہ بھی کچھ ایسا ہی واقعہ ہے۔"

"میں سُن رہا ہوں۔"

"شہر سے مغرب کی طرف نہر والے پُل سے ایک سڑک میرے ننھیالی گاؤں کو جاتی ہے۔ میں اس سڑک پر جب بھی سفر کرتا گیارہویں اور بارہویں میل پتھر کے درمیان کوئی نہ کوئی چھوٹا یا بڑا، معمولی یا غیر معمولی واقعہ ضرور پیش آتا۔"

"اچھا یا بُرا؟"

"عموماً ناخوشگوار ـــــ اس بات کا احساس مجھے کئی برسوں کے تجربے اور مشاہدے کے بعد ہوا۔ اگر میں بس پر سوار ہوتا تو اس کا ٹائر پنکچر ہو جاتا یا بریک فیل ہو جاتے اور وہ حادثے کا شکار ہوتے ہوتے بچتی۔ اگر میں سکوٹر یا موٹر سائیکل پر سفر کرتا تو سڑک کے اس ٹکڑے پر کسی جگہ پلگ میں کچرا آجاتا۔ یا کلچ یا گیئر کی تار ٹوٹ جاتی۔ ایک دفعہ مجھے اسی جگہ تیز آندھی نے آلیا اور میں کھائی میں گرتے گرتے بچا۔"

"کافی پُرانی بات ہے جب تمہارے پاس سکوٹر تھی۔"

"ہاں ـــــ جب میں نے گاڑی خرید لی اور ایک بار گرمی کی چھٹیوں میں بیوی بچوں کو لے کر گاؤں گیا تو عین گیارہویں اور بارہویں میل کے درمیان پہنچ کر انجن سے دھواں نکلنے لگا اتر کر دیکھا تو ریڈی ایٹر میں سُوراخ ہو گیا تھا اور سارا پانی بہہ چکا تھا۔"

"اس کھٹارہ کو لمبے روٹ پر لے جانے سے پہلے اچھی طرح چیک کرا لینا تھا یہ تو تمہاری اپنی غلطی تھی۔"

"ہاں میری غلطی تو تھی مگر سوال یہ ہے کہ عین اسی جگہ پہنچ کر کیوں ایسا ہوا۔ پھر یہی نہیں۔ اس روز ہم وہاں سے بار بار پانی ڈالتے گاؤں پہنچے۔ اگلے روز گاڑی ٹھیک

کرائی۔ مگر واپسی پر پھر اسی جگہ پہنچ کر فین بیلٹ ٹوٹ گیا۔ کہو یہ بھی میری غلطی تھی؟"

"اچھا خیر پھر کیا ہوا؟"

"اس طرح کے واقعات جب بار بار پیش آئے تو میں چونکا اور سڑک کے اس حصّے پر سفر کرتے ہوئے ڈرنے اور محتاط رہنے لگا۔ ایک دفعہ ایسا کوئی واقعہ پیش نہ آیا اور ہم لب میں بیٹھے خطرے کی حد پار کر رہے تھے کہ کسی مسافر کا کنڈکٹر سے پیسوں کے لین دین پر جھگڑا ہو گیا اور مسافر نے غصّے میں آکر ایسی غلیظ گالی بک دی کہ اپنی چھوٹی بہن کی موجودگی کی وجہ سے مجھے شرم سے پسینہ آگیا۔"

"بھئی خوب ——— یہ بھی اس سڑک کا قصور تھا گویا۔"

"میں نہیں جانتا کس کا قصور تھا۔ مگر سڑک کا یہ ٹکڑا میرے لیے ایک خاص اہمیت اختیار کر گیا مجھے بُرے بُرے خیالات ستاتے، کہیں اس جگہ کی مٹّی مجھے اپنی طرف تو نہیں بُلاتی۔ اور کہیں آخر کار کسی حادثے کا شکار ہو کر مجھے یہیں کہیں ہلاک تو نہیں ہو جانا۔ اور اگر ایسا تھا تو یہ قبل از وقت اشارے کون کرتا تھا اور کیوں۔ ظاہر ہے میں اس سڑک پر سفر کرنا ترک نہیں کر سکتا تھا زیادہ نہیں تو نیکی بدی کے موقعوں پر تو ننھیال جانا ہی پڑتا تھا۔ پھر بھی میری کوشش ضرور ہوتی گھوم پھر کر کسی اور رستے سے جاؤں اور اگر جانا ایسا ضروری نہ ہو تو ملتوی کر دوں۔"

"مگر تم نے کبھی مجھ سے اس کا ذکر نہیں کیا؟"

"ہاں ——— میں اسے اپنا وہم ہی سمجھتا تھا۔ تم سے کہتا تو تم بھی اسے میرا وہم ہی سمجھتے۔"

"میں تو اب بھی یہی سمجھتا ہوں یہ سارا نفسیاتی مسئلہ ہے اگر تم اس سڑک پر سفر کے دوران میں اپنی حسیات کو اس قدر بیدار نہ رکھتے اور ہر لمحے چوکنّے نہ رہتے تو تمہیں بہت سی ناخوشگوار باتوں کو سڑک کے اس ٹکڑے سے وابستہ کرنے کی ضرورت ہی

پیش نہ آتی۔ اچھا خیر تم آگے بتاؤ پھر کیا ہوا۔

"میں نے شعوری طور پر کوشش شروع کر دی۔

دورانِ سفر خود کو مطالعے میں مصروف رکھتا یا آنکھیں بند کر لیتا اس کے باوجود کچھ نہ کچھ ہو جاتا۔ بعض اوقات تو بہت ہی معمولی سی بات ہوتی کوئی مسافر بس پر چڑھتے یا اُترتے ہوئے پاؤں کچل دیتا یا کوئی ہم سفر کھڑکی سے باہر تھوکتا تو ہوا سے تھوک اُڑ کر میرے منہ پر آ پڑتا۔ اس کے باوجود میں نے اپنے وہم سے چھٹکارا پانے کی کوشش جاری رکھی۔"

"تم وہاں کبھی اُترے نہیں۔ میرا مطلب ہے اس علاقے میں گھوم پھر کر نہیں دیکھا کہ تاریخ جغرافیہ کیا ہے؟"

"کئی بار ارادہ کیا کہ اس پورے علاقے کا سروے کروں اور آس پاس کی آبادیوں ویرانوں، قبرستانوں اور لوگوں کے بارے میں معلومات حاصل کروں اور اندازہ لگاؤں کہ میرا اس علاقے سے کیا تعلق ہے اور یہ بھی دیکھوں کہ کہیں کوئی تخریبی طاقت تو جاگزیں نہیں ہے۔ کتابوں میں پڑھی اور سُنی سُنائی فضول فضول باتیں ذہن میں آتیں کوئی دشمن یا حاسد مجھے نقصان پہنچانے کے لیے وہاں بیٹھا چلّہ نہ کاٹ رہا ہو۔ جادو ٹونا نہ کر رہا ہو۔"

"آخر آ گئے نہ راہ راست پر۔"

"بالکل نہیں۔ میں ایسی باتیں سوچتا ضرور تھا مگر مجھے اب بھی ایسی باتوں پر یقین نہیں ہے۔ اس وقت بھی نہیں تھا بس یوں سمجھ لو یقین نہ رکھتے ہوئے بھی شک اور موہوم سا ایک خدشہ دل کے کسی کونے میں موجود تھا۔"

"پھر کیا ہوا۔"

"پھر ایک عجیب واقعہ ہوا۔ میں نخیال سے ایک گھی کا ٹین لے کر لوٹ رہا تھا۔ کنڈیکٹر نے اسے چھت پر رکھوا دیا تھا اور مجھے بتا دیا تھا کہ شہر کی محصول چونگی پر اُتر کر اس

کا محصول ادا کرنا ہوگا۔"

"ہاں سات نمبر چونگی آتی ہے اس سڑک پر۔"

"ہاں وہیں سات نمبر چونگی پر محصول ادا کرنے کے لیے اُترا۔"

"وہ تو شہر کے باہر تیسرے چوتھے میل پر واقع ہے اس کا اس گیارہویں میل سے کیا تعلق۔"

"تم سُنو تو ——————"

"چلو کہو۔"

"محصول دینے لگا تو احتیاطاً ایک نظر گھی کے ٹین کو دیکھ لینا چاہا مگر یہ جان کر میرے ہوش اُڑ گئے کہ بس کی چھت پر ٹین موجود نہیں تھا۔ کنڈکٹر اور مسافروں سے پوچھنے پر پتہ چلا کہ دو سٹاپ پیچھے جو سواریاں اتری تھیں۔ انہوں نے گھی کے کچھ کنستر اتارے تھے۔ کنڈکٹر نے ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر دیا۔"

"جب وہ لوگ اپنے اور تمہارا کنستر اتار رہے تھے تم کہاں تھے؟"

"یار میں اس سڑک کی نحوست سے خود کو بچانے کے لیے آنکھوں پر رومال رکھے اونگھ رہا تھا۔ میں چاہتا تھا بے خبری میں سڑک کا وہ حصہ گزر جائے۔"

"بے خبری میں مبتلا ہونے میں تو تم خوب کامیاب ہوئے۔"

"خیر ڈرائیور اچھا آدمی تھا کچھ سواریوں نے بھی ہمدردی کا اظہار کیا اور وہ بس واپس لے جانے پر رضامند ہو گیا اور مجھے گیارہویں اور بارہویں میل کے درمیان ایک سٹاپ پر اُتار کر بس واپس چلی گئی۔ میرے لیے اب اس بات میں شک اور شُبے کی گنجائش نہ رہی تھی کہ یہ جگہ میرے لیے واقعی نحس تھی اور میرے شکوک محض واہمہ نہیں تھے۔ ایک خیال یہ بھی آیا کہ گھی کے کنستر کو بلا ٹلنے کے سلسلے کا صدقہ یا قربانی سمجھوں اور لوٹ جاؤں کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی بڑی مشکل یا مصیبت میں پھنس جاؤں مگر تمہیں پتہ ہے ایک تو ابا جی بنا پستی گھی

نہیں کھاتے تھے۔ دوسرے سوچا کہ اگر موقع ہاتھ آہی گیا ہے تو ضرور اس جگہ کے اسرار کو جاننا چاہیئے۔"

"یہ تم نے اچھا فیصلہ کیا۔"

"بس اسٹاپ سنسان پڑا تھا۔ سڑک کے دونوں جانب ہری بھری فصلیں تھیں ایک پیدل چلنے کا کھلا سا راستہ تھا میں اس پر چلنے لگا۔ میں بے حد چوکنا تھا۔ کہیں پتا بھی ہلتا تو میں ٹھٹک جاتا۔ طرح طرح کے خدشات دل میں سر اٹھاتے کہیں کسی کھیت سے نکل کر کوئی ڈاکو یا جانور حملہ نہ کر دے۔ کسی بل سے کوئی زہریلا سانپ نہ نکل آئے کسی باؤلے کتے کا سامنا نہ ہو جائے۔"

"یار تم گاؤں کے رہنے والے ہو پھر اتنا ڈرے۔"

"ڈر تو میرے اندر ایک مدت سے چھپا ہوا تھا اس سارے علاقے کے بارے میں۔ ورنہ عام حالات میں مجھے کبھی ڈر نہیں لگا۔"

"اچھا تو پھر کیا ہوا؟"

"کوئی ڈیڑھ دو میل چلنے کے بعد چند راہگیروں سے ملاقات ہوئی۔ ان سے پتہ چلا کہ دیہاتیوں کا ایک چھوٹا سا قافلہ جن کے پاس گھی کے چند کنستر بھی تھے۔ سیم نالے کے پل کے قریب جاتا دیکھا گیا ہے۔ سیم نالے کا پل زیادہ دور نہیں تھا۔ میں نے اپنی رفتار بڑھا دی اور لوگوں سے پوچھتا ہوا کوئی تین کوس کا فاصلہ طے کر کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں پہنچا اور ان لوگوں کا کھوج لگانے میں کامیاب ہو گیا جو ابھی ابھی گھر پہنچے تھے۔"

"بڑی ہمت کی تم نے ——— تمہیں دیکھ کر پریشان تو ہو گئے ہوں گے؟"

"ہاں ——— سہ پہر کا وقت تھا ایک نیم شکستہ مکان کے کھلے دالان میں بہت سے لوگ بیٹھے تھے۔ قریب ہی سامان رکھا تھا۔ میراثین بھی وہاں پڑا تھا۔ بڑی عمر کی ایک صحت مند عورت پیڑھی پر بیٹھی تھی۔ درمیانی عمر کی دو عورتیں اور تین مرد قریب ہی

چارپائیوں پر بیٹھے تھے۔ ایک آدمی چولھے کے پاس بیٹھا حقّے کی چلم تازہ کر رہا تھا اور سانولے رنگ کی ایک نوجوان لڑکی سب کو باری باری لسّی پلا رہی تھی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا میں سیدھا اندر چلا گیا وہ مجھے دیکھ کر چونکے اور پریشان ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگا۔"

"اُن کے تو گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ تم وہاں پہنچ جاؤ گے۔"

"ہاں ——— بڑے حیران ہوئے، چارپائیوں پر بیٹھے مردوں میں سے ایک جو نسبتاً زیادہ عمر کا تھا اُٹھ کر آگے آیا اور بولا۔ آؤ بابو جی اندر آجاؤ۔"

"اندر تو تم آ ہی چکے تھے پھر۔"

"بڑی عمر کی عورت بھی اُٹھ کھڑی ہوئی اور بغیر کچھ کہے سُنے میرے گھی کے کنستر کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگی۔ بس چلی گئی تو ہمیں پتہ چلا یہ ہمارا ٹین نہیں ہے۔"

"پھر تم نے کیا کہا؟"

"میں کیا کہتا مجھے پیاس لگی تھی۔ تھکا ہوا بھی تھا۔ انہوں نے بیٹھنے کو کہا میں بیٹھ گیا پھر پہلے انہوں نے دودھ کی لسّی پلائی پھر میرے منع کرنے کے باوجود چائے بنانے لگے بار بار کہتے کہ مجھے جو تکلیف ہوئی ہے اس کا انہیں افسوس ہے اور انہوں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا۔"

"اور تم نے یقین کر لیا؟"

"ہاں مجھے یقین ہو گیا کہ غلطی سے ایسا ہوا تھا ورنہ وہ لوگ ایسے نہیں تھے وہ مجھ سے جلد ہی گھل مل گئے اور آپس میں تفصیلی تعارف ہوا۔ بڑی عمر کی عورت نے مجھے بتایا کہ وہ گھی کے کنستر اپنی بیٹی کی شادی کے لیے دوسرے کسی گاؤں سے خرید کر لائے تھے۔ اگلے چاند کی تیرہ تاریخ کو ان کے ہاں بارات آنے والی تھی۔ ان کا اصرار تھا کہ میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ اس شادی میں شامل ہوں۔ میں نے مروّتاً وعدہ کر لیا۔ لیکن میرا ایسا

کوئی ارادہ نہیں تھا۔ پھر ان کا ایک آدمی کنستر اُٹھا کر مجھے سڑک پر چھوڑنے آیا۔"

"پیدل ؟"

"ہاں ادھر کوئی تانگہ وغیرہ نہیں تھا۔ غریب لوگ تھے۔ کوشش کرتے رہے کہ گھوڑا یا سائیکل کہیں سے مانگ لائیں مگر کچھ انتظام نہ ہو سکا بہرحال جب میں سڑک پر آیا۔ شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ بس میں بیٹھا تو مجھے اس لڑکی کا خیال آیا جس نے میرے لیے چائے بنائی تھی اور جس کی شادی میں شرکت کا میں نے اوپر سے دل سے وعدہ کیا تھا۔"

"کوئی خاص بات تھی اس میں ؟"

"ہاں ——— یوں تو گاؤں کی ایک عام سی معمولی شکل وصورت کی لڑکی تھی اس کے مقابلے میں اس کی بھاوجیں زیادہ خوبصورت اور صحت مند تھیں مگر اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے ایسا لگا تھا جیسے میں اسے پہلے سے جانتا ہوں اور اسے کہیں دیکھ رکھا ہے۔ اگرچہ اس نے میرے ساتھ کوئی بات نہ کی اور نہ ہی میری طرف غیر معمولی طریقے سے متوجہ ہوئی تھی مگر پھر بھی اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی اپنائیت موجود تھی بالکل ایسی جیسی کسی پُرانے جاننے والے یا قریبی رشتہ دار کی آنکھوں میں ہو سکتی ہے۔"

"تمہاری کسی سابقہ محبوبہ سے شکل ملتی ہو گی ؟"

"نہیں یار یہ مذاق کی بات نہیں۔ اُسے دیکھ کر کوئی ایسا ویسا خیال میرے دل میں پیدا نہیں ہوا۔ بس مجھے وہ اچھی لگی اور کچھ پُراسراری بھی۔ اور گیارہویں اور بارہویں میل کے درمیان پیش آنے والے مختلف واقعات کی روشنی میں میں یہ فیصلہ کرنے میں شاید حق بجانب تھا کہ میری دیرینہ اُلجھن کا اُس لڑکی سے ضرور کوئی تعلق تھا۔ چنانچہ میں نے گھر پہنچتے پہنچتے طے کر لیا کہ اس کے بیاہ پر ضرور آؤں گا اور اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔"

"پھر تم گئے شادی پر؟"

"نہیں ——— میرا ارادہ ضرور تھا کہ میں فرزانہ کو بھی ساتھ لے چلوں مگر اتفاق ایسا ہوا کہ جس روز شادی تھی اُسے گردے کا درد ہو گیا اور ننھا پہلے ہی بخار میں مبتلا تھا۔ تمہاری بھابی نے اس لڑکی کے لیے جوڑا بھی بنایا ہوا تھا اور چھوٹی موٹی کچھ دوسری چیزیں بھی خریدی ہوئی تھیں۔ کہنے لگی کہ آپ چلے جائیں مگر میں اُسے اس حالت میں چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا۔ ہم اسی بحث و تکرار میں تھے کہ ابا جی نے سُن لیا اور کہنے لگے کہ میں چلا جاتا ہوں اور یہ چیزیں پہنچا آتا ہوں۔"

"اور تم نے جانے دیا؟"

"ہاں وہ کہتے تھے کہ انہیں گاؤں کی شادی دیکھے بڑا عرصہ ہو گیا ہے اس بہانے گھوم پھر آئیں گے۔"

"پھر؟"

"ہم نے انہیں نام پتہ بتایا اور وہ چلے گئے خیال تھا۔ شام کو لوٹ آئیں گے، مگر ان لوگوں نے انہیں روک لیا۔ بڑی خاطر تواضع کی اور میرے بیوی بچوں کے لیے تحفے تحائف بھی بھجوائے۔ ابا جی دیر تک وہاں کی تفصیلات بتاتے رہے۔ پھر مجھے الگ بُلا کر انہوں نے مجھے اس لڑکی کے بارے میں جس کا بیاہ ہوا تھا۔ ایک عجیب بات بتائی۔"

"اچھا۔ وہ اُس سے مل کر آئے تھے؟"

"ہاں ——— کہنے لگے کہ جب تمہاری والدہ کا انتقال ہوا تھا اس وقت تم تین سال کے تھے اور ان کی یہی عمر تھی جو اس لڑکی کی ہے اور یہی ناک نقشہ اور قد بُت۔ بال برابر بھی فرق نہیں ہے۔"

"پھر تم نے کیا کہا؟"

"میں کیا کہتا۔ مجھے تو وہ لڑکی پہلے ہی پُراسرار معلوم ہوتی تھی۔ ابّا جی نے مجھے ایک نئی الجھن میں ڈال دیا جس کا حل کسی کے پاس نہ تھا۔"

"پھر تم ملے اس سے کبھی؟"

"میں نے دو تین بار کوشش کی مگر ملاقات نہ ہو سکی پھر جب ابّا جی کے انتقال کی خبر کہیں سے ان لوگوں تک پہنچی تو وہ چالیسویں پر آئے۔"

"وہ بھی آئی تھی؟"

"ہاں اس کا میاں بھی اس کے ساتھ تھا۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر وہ لوگ چلے گئے مگر میں نے انہیں تصویر بنانے پر رضامند کر لیا۔"

"تصویر؟"

"ہاں فوٹو گراف: جو سارے جھگڑے کی بنیاد تھا۔"

"مگر تم نے تصویر کیا کرنا تھی؟"

"تم جانتے ہو یار ——— میں بچپن سے ایک بڑی محرومی کا شکار رہوں جب میری والدہ کا انتقال ہوا میں بہت چھوٹا تھا۔ مجھے اگر کوئی بتاتا کہ فلاں عورت کی شکل تمہاری والدہ سے ذرا سی بھی ملتی ہے تو میرے دل میں اس عورت کے لیے محبت اور احترام پیدا ہو جاتا۔ اس کی صورت تو بقول ابّا جان کے ہو بہو وہی تھی۔"

"اچھا تو تم نے تصویر بنالی؟"

"ہاں اور اسے بڑا کر کے فریم میں لگوا لیا۔ کچھ دن تو فرزانہ خاموش رہی پھر اس نے تصویر غائب کر دی۔"

"ٹھیک کیا انہوں نے آخر بیوی ہیں کیسے برداشت کر لیتیں کہ ایک غیر اور جوان عورت کی تصویر گھر میں ہو؟"

"یار حد کرتے ہو تم بھی اُسی کی طرف داری کرنے لگے وہ غیر عورت کی

نہیں میری مرحومہ ماں ۔"

"تم سے دس بارہ سال چھوٹی تو ہو گی ۔"

"ہاں چھوٹی تو ہے ۔"

"پھر تم اسے ماں کیسے سمجھ سکتے ہو ۔"

"کیوں نہیں سمجھ سکتا ۔ میں اگر سو سال کا بھی ہو جاؤں وہ نوجوان ہی رہیں گی ، انہوں نے بڑھاپا تو دیکھا ہی نہیں تھا ۔"

"یار کیوں مجھے کنفیوز کرتے ہو ۔ تصویر بہرحال ان کی تو نہیں نا ۔"

"مگر میں نے تو اپنی ماں کی سمجھ رکھی ہے ۔"

"کیا بچپنا ہے یار ——— اتنی سی بات پر تم نے بھابی کو خفا کر کے میکے جانے دیا ۔ اور تم اس قدر مدر فکسیشن کا شکار کیوں ہو رہے ہو ۔"

"خدا کے لئے تم ——— اب ایڈی پس کمپلیکس پر لیکچر شروع نہ کرنا ۔"

"اچھا ذرا ۔۔۔ زیارت تو کراؤ خاتون کی ؟"

"یہ دیکھو ——— اور خود ہی فیصلہ کرو کیا اُسے دیکھ کر کوئی بُرا خیال آسکتا ہے دل میں ۔"

"بھئی کمال ہے ۔"

"کیوں کیا ہوا ؟"

"یار اسے تو میں جانتا ہوں ۔"

"کیسے ؟"

"یار ایسا لگتا ہے جیسے اسے کہیں دیکھا ہوا ہے ۔"

"چالیسویں پر تم یہاں تھے نہیں ۔ پھر کہاں دیکھا ہو گا ۔"

"ٹھہرو مجھے یاد کرنے دو ۔"

"کرلو۔"

"یار میرا خیال ہے بعض صورتیں ایسی ہوتی ہیں کہ پہلی بار دیکھو تو بھی لگتا ہے جیسے ہمیشہ سے جانی پہچانی ہیں۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟"

"اور بعض عورتوں میں ماں پن اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ ہر عمر میں ہر کسی کو ماں معلوم ہوتی ہیں۔ مجھے تو خود یہی لگ رہا ہے۔"

"پتہ نہیں تم کیا کہہ رہے ہو۔"

"میں ٹھیک ہی کہہ رہا ہوں لاؤ مجھے ٹیلی فون دو۔ میں بھابی سے بات کرتا ہوں۔"

"اس سے تو تم بات کرو۔ مگر میں تمہاری اپروچ سے مطمئن نہیں ہوں۔"

زیرو زیرو

اس واقعہ کو کتنی برس ہو چکے ہیں

ایک روز وہ کسی دوست کو الوداع کہنے ائیر پورٹ گیا ہوا تھا کہ اس کی نظر درمیانی عمر کی ایک خاتون پر پڑی۔ جس کا چہرہ اسے جانا پہچانا معلوم ہوا اس نے یاد کرنیکی کوشش کی مگر الجھ سا گیا۔ مگر پھر اس کے اندر مشین سی چلنے لگی۔ نو سے ضرب ننانوے اور نو سو ننانوے سے ضرب۔ دس قطاروں میں نو پودے۔ پانچ خطوط مستقیم سے دائرے کے سولہ حصے اور اسے یاد آ گیا وہ جمیلہ تھی۔

اپنے والد کے تبادلے کے بعد کسی دوسرے شہر چلے جانے سے پہلے وہ اس کے پڑوس میں رہتی تھی۔ دونوں ایک ساتھ کھیلتے اور سکول آتے جاتے تھے۔ وہ اسے حسابی کھیلوں، پہیلیوں اور معموں سے پریشان کیا کرتا تھا۔ پلک جھپکنے میں لمبی لمبی ضربیں دے لیتا تو وہ منہ میں انگلیاں ڈالے حیرت اور خوشی سے اسے دیکھتی رہتی اسے ہندسوں کے طرح طرح کے کھیل آتے تھے۔ پندرہ کنکریوں اور بارہ جوتوں کے کھیل۔ پانچ قطاروں میں دس پودے ہر قطار میں چار۔ وہ اسے بڑے خوبصورت خط لکھا کرتی تھی۔ اور وہ خطوں میں ہندسوں کے معمّے لکھ بھیجتا تھا۔ جن کے صحیح جوابات جاننے کے لئے وہ بے چین ہو کر ملنے آجاتی تھی۔

اس نے آگے بڑھ کر اسے تلاش کیا۔ وہ لوگوں کے ہجوم سے الگ تھلگ کھڑی کسی نئی فلائیٹ کے آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے دوبارہ دیکھ کر اس کے اندر بلب سا روشن ہو گیا۔ دل دھڑکنے لگا۔ اس نے تھوک نگل کر گلا تر کیا اور کانپتی آواز میں لیکن بڑے وثوق سے پوچھا ؟"

"آپ جمیلہ ہیں — جمیلہ حق ؟"

"جی ہاں" اس نے اسے پہچاننے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے جواب دیا" میں نے آپ کو نہیں پہچانا"

اس کے بدن میں خوشی کی لہر سی دوڑ گئی۔ بیتابی سے لڑکھڑاتی آواز میں بولا

"میرا نام کمپیوٹر — معاف کیجئے کریم ہے۔ عبدالکریم"

عبدالکریم ؟ — اوہ نو — ارے سچ مچ آپ عبدالکریم ہیں"

"میں نے آپ کو فوراً پہچان لیا"

"آپ اس قدر بدل گئے ہیں ؟"

"بس ایسا ہی ہے"

پھر اس نے بہت سی باتیں پوچھیں بہت کچھ بتایا۔ وہ اپنی کسی رشتہ دار کو لینے آئی تھی۔ وہ اب اسی شہر میں آ گئی تھی۔ اور اپنی بہن اور بہنوئی کے پاس رہتی تھی۔ اس کے دو بیٹے تھے۔ شوہر حادثے میں فوت ہو گئے تھے۔ لیکن جائیداد سے معقول آمدنی تھی۔ اسے اس کے بیوہ ہو جانے کی خبر سن کر افسوس ہوا اور اس نے اس کا اظہار بھی کیا لیکن اس سے زیادہ اسے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ اس کے بہنوئی ایک بڑے عہدے پر فائز اور نہایت با اثر آدمی تھے۔ اگر وہ اس کے باس کو اشارتاً بھی کہہ دیں تو اس کی پروموشن فوراً ہو سکتی تھی۔ فلائیٹ آ گئی تھی۔ جمیلہ نے جلدی جلدی اسے اپنا پتہ بتایا مکان نمبر ۸۱۹۔ گلی نمبر ۲۷ سیکٹر ایف ایٹ فور اور کسی روز گھر آنے کی دعوت دے کر

چلی گئی۔ مگر اپنی یادوں کی خوشبو چھوڑ گئی۔ جمیلہ کا پتہ کمپیوٹر میں محفوظ ہو چکا تھا۔

وہ کئی برسوں سے ایک بڑے دفتر میں ایک چھوٹی سی پوسٹ پر کام کر رہا تھا۔ یوں کہنے کو تو اس کا ایک ہی باس تھا۔ مگر حقیقتاً دفتر کے دوسرے شعبوں کے کئی ایک انچارج بھی اس پر حکمرانی کرتے تھے۔ اس طرح اس کے پاس بے شمار کام جمع ہو جاتا تھا۔ مگر وہ کام سے کبھی نہیں گھبراتا تھا۔ اسے چائے ملتی رہتی تو وہ مسلسل دس دس بارہ بارہ گھنٹے روزانہ کام کر سکتا تھا۔ چائے اس کے لئے ایسی ہی ضروری تھی۔ جیسے انجن کے لئے پٹرول یا تیل اس کی اس کمزوری سے دفتر کے سب لوگ آگاہ تھے۔ چنانچہ اس کے دوسرے ساتھی بھی چائے کے عوض اسے اپنا کام دے جاتے تھے۔

اس نے ریاضی کے ساتھ گریجوایشن کی تھی۔ لیکن اگر اس کے پاس یہ ڈگری نہ بھی ہوتی تو بھی اعداد و شمار سے اس کی دلچسپی کم نہ ہوتی ـــــ اسے بچپن ہی سے ریاضی الجبرا اور اعداد و شمار پر مبنی مضامین سے گہرا شغف تھا۔ فارغ اوقات میں وہ رسالہ اخبار پڑھنے یا فلم دیکھنے کی بجائے کوئی مشکل سوال لے کر بیٹھ جاتا۔ ریاضی کے دقیق مسائل حل کر کے اسے اتنی ہی ذہنی آسودگی ملتی جتنی شاعر کو اچھی غزل کہنے اور مصور کو تصویر بنانے میں مل سکتی ہے۔ اسے اعداد و شمار سے متعلق دنیا بھر کی بجھارتیں اور معمے یاد تھے اس کا دعویٰ تھا۔ اس نے آج تک ریاضی کا کوئی مسئلہ حل کئے بغیر نہیں چھوڑا تھا۔ مشکل سے مشکل سوال کو وہ منٹوں میں حل کر لیتا تھا۔ اور اگر کبھی کسی سوال میں الجھ جاتا تو اس وقت تک کھانا نہ کھاتا۔ (صرف چائے پیتا رہتا) جب تک اسے حل نہ کر لیتا۔ طالب علمی کے زمانے میں بھی اسے کھیلوں جلوسوں اور دوسری تفریحات سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ اسے کوئی پارٹنر مل جاتا تو وہ حسابی کھیلوں سے دل بہلاتا۔ اور دوسروں کو پریشان کرتا رہتا۔ ریاضی میں اس کی قابلیت ہر جگہ مسلمہ تھی۔ اگر فائنل ایئر میں وہ بیمار نہ پڑ جاتا۔ تو شاید بڑی اچھی ڈویژن حاصل کرتا۔ اس کا ارادہ شماریات یا ریاضی میں ایم اے کرنے کا تھا

مگر مالی دشواریوں کی وجہ سے اسے ملازمت کرنا پڑی

ملازمت ملنے سے پہلے وہ کچھ عرصہ بیکار رہا تھا۔ دن بھر مختلف دفتروں اور اداروں کے چکر لگاتا درخواستیں لکھتا اور بھیجتا رہتا۔ پھر جب اسے معقول ملازمت ملنے کے امکانات کم نظر آئے تو اس نے اس دفتر میں ایک معمولی سے اسٹیمیٹر کی پیش کش قبول کر لی۔ ملازمت چونکہ اس کے مزاج کے مطابق اور اعداد و شمار سے متعلق تھی اس لئے وہ مطمئن بھی تھا۔ اسکے فرائض میں دیئے ہوئے نقشوں اور پیمائشوں سے عمارتوں، سڑکوں، نالیوں اور پائپ لائنوں کی مقداریں اور رقبے نکالنا اور شیڈول آف ریٹس کے مطابق نرخ لگا کر اخراجات کا تخمینہ لگانا تھا۔ یا پھر ذیلی دفتروں سے آئے ہوئے ایسے ہی تخمینوں کی جانچ پڑتال کرنا۔ انجینیرنگ کی بعض اصطلاحات سے وہ شروع شروع میں ناواقف تھا۔ مگر ہند سے جہاں اور جیسے بھی ہوں اس کے لئے کوئی اجنبیت نہیں رکھتے تھے۔ اس لئے جلد ہی وہ ایک باکمال اسٹیمیٹر کے طور پر پہچانا جانے لگا۔

اس کی ریاضی دانی اور حساب کتاب سے دلچسپی کے پیش نظر چیف اکاونٹنٹ بھی اس سے مدد لینے لگا وہ کنٹین کے لڑکے کو دو چائے کا آرڈر دیتا اور چار سو ضربوں اور تقسیموں کا کام اس کے سامنے رکھ جاتا۔ سرکل ہیڈ ڈرافٹسمین اس سے بے تکلف ہوا تو ڈرائنگ برانچ کا کیلکولیشن ورک بھی اس کے حصے میں آگیا۔ اس کے علاوہ بڑے دفتر کے کوانٹٹی سرویئر اور ملحقہ دفتروں کے چھوٹے بڑے انجینیرز بھی اکثر اسے بیگار میں پکڑے رکھتے اور چائے اور سموسوں کے بدلے تین دن کا کام ایک دن کرا کر چلتے بنتے۔

اس کا باس اس کے کام سے بڑا خوش اور مطمئن تھا۔ اس کے کام میں غلطیاں نہ ہونے کے برابر ہوتی تھیں اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ضربوں اور تقسیموں کی ایک ایسی مشین تھا۔ جو کبھی خراب ہوتی تھی۔ نہ تھکتی تھی۔ اور کئی کئی روز کا کام چند گھنٹوں میں مکمل کر دیتی تھی۔

پھر دفتر میں اس کی مدد کے لئے کیلکولیشن مشین آگئی۔ لیکن اکاونٹنٹ نے اس پر یہ کہہ کر قبضہ کر لیا کہ اسٹیمیٹر صاحب تو خود کمپیوٹر ہیں انہیں ایسی معمولی مشین کی کیا ضرورت ہے۔ اکاونٹنٹ کی یہ بات یار لوگوں کو اتنی پسند آئی اور شائد اسے بھی کہ اسے کمپیوٹر کے نام سے پکارا جانے لگا۔ اس نے کمپیوٹر نہیں دیکھا تھا۔ لیکن اس کا خیال تھا۔ کہ اس میں اور کمپیوٹر میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہوگا۔

جب اکاونٹس برانچ کے عملے کو کیلکولیٹر پر کام کرنے کی اچھی مشق اور مہارت ہو گئی تو دفتر میں اکثر کیلکولیشن ورک کے مقابلے ہونے لگے۔ مرکب اعداد۔ کسور اور جذر وغیرہ کی رکاوٹوں کی وجہ سے اکاونٹنٹ ہار جاتا۔ اور وہ شرط جیت کر خود بھی ان سے چائے پیتا اور دوسروں کو بھی پلواتا۔ ایسی چھوٹی چھوٹی حقیر خوشیوں کے سہارے اس نے بہت سے سال گزار دیئے۔

آٹھ برس گذر گئے۔

دفتر میں کئی ایک لوگ نئے آگئے کئی ایک ترقی پاکر یا ریٹائر ہو کر چلے گئے اس کے باس بھی بدلتے رہے۔ مگر اس کے کام کی نوعیت اور رفتار میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔

ان آٹھ برسوں میں اس نے بہت سے دوسرے محکموں میں بہتر ملازمت کے لئے درخواستیں بھجوائیں۔ انٹرویوز دیئے۔ مگر سفارش نہ ہونے کی وجہ سے وہ کہیں بھی بہتر ملازمت حاصل نہ کر سکا۔ یوں بھی وہ اپنی آٹھ سالہ ملازمت آسانی سے نہ چھوڑ سکتا تھا۔ تنخواہ میں سالانہ ترقیوں کی وجہ سے تھوڑا بہت اضافہ ہو گیا تھا۔ اور اسے کوانٹٹی سرویئر کے عہدے پر ترقی پانے کی قوی امید تھی۔ لیکن یہ بات صرف اس کا باس اور دفتر کا سپرنٹنڈنٹ جانتے تھے۔ کہ وہ کبھی ترقی نہیں پا سکے گا۔ کیوں کہ وہ اس جیسے باکمال اسٹیمیٹر سے محروم نہیں ہونا چاہتے تھے۔

وقت کے ہندسے ضربیں کھاتے اور جمع ہوتے رہے۔

اس کے بچے تعلیم کے اعلیٰ درجوں میں پہنچ گئے۔ اس کی چھوٹی بہنیں جوان ہو گئیں۔ اور اس کی کنپٹیوں پر سفید بال گنتی کی حد سے بڑھنے لگے۔

والدہ اور بیوی کے زیورات تو پہلے ہی بک چکے تھے۔ ایک مکان رہ گیا تھا۔ آخر اسے گروی رکھ کر اس نے بہنوں کی شادیاں کیں مگر جب وہ انہیں رخصت کر چکا تو اسے محسوس ہوا کہ وہ اس کا دماغ بھی جہیز میں اپنے ساتھ لے گئی ہیں۔ اس سے دفتر کے کام میں اکثر چھوٹی چھوٹی غلطیاں ہونے لگیں۔ لیکن دفتر کا عملہ اس پر اس قدر اعتماد کرتا تھا کہ اس کی غلطیاں پکڑے جانے کی نوبت کبھی نہ آئی۔

انہی دنوں اس کے دو ایک دوست پروموٹ ہو گئے اس نے ان سے اس خوشی میں چائے بھی پی اور مٹھائی بھی کھائی۔ لیکن اسے چائے میں مزہ آیا نہ مٹھائی میں اس روز وہ اپنی سروس کے پندرہ سالوں کے مہینے، ہفتے دن اور گھنٹے شمار کرتا رہا اور اسے رات بھر نیند نہ آئی۔

اس کے بعد اس نے خود کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی مگر اس کے کام میں غلطیوں کی تعداد بڑھنے لگی انہی دنوں اسے ایک عجیب سی لت پڑ گئی تھی۔ وہ دفتر سے آتے جاتے اور بازار میں سودا سلف خریدتے ہوتے آتی جاتی بسوں، کاروں اور سکوٹروں کی نمبر پلیٹیں پڑھتا رہتا۔ نمبر پلیٹیں پڑھنا تو کوئی ایسی عجیب بات نہ تھی۔ مگر نمبر پلیٹوں کے اعداد کو باہم جمع کرنا نہایت خطرناک تھا۔ اس نے کئی بار مصمم ارادہ کیا کہ وہ کسی گاڑی کی نمبر پلیٹ کی طرف دھیان نہیں دے گا۔ مگر جونہی کسی گاڑی کا ہارن سنائی دیتا یا بریک لگنے کی آواز سنائی دیتی اس کے اندر مشین کا سوئچ آن ہو جاتا آر آئی اے فائیو نائن ڈبل فور فائیو پلس نائن پلس فور پلس فور از ایکوئل ٹو ٹوئنٹی ٹو۔

مشین چلتی رہتی۔ اور ٹوئنٹی ٹو کے دونوں ہندسے پھر سے جمع ہوتے ٹو پلس ٹو

ازا یکویٹیل ٹو فور

یہ سب کچھ لمحہ بھر میں خود بخود ہو جاتا اسے پتہ ہی نہ چلتا کہ کب اور کیسے اس نے نمبر پلیٹ کے ہندسوں کو جمع کرنا شروع کیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے کوئی دوسری گاڑی آجاتی اور اس کا ذہن مصروف ہو جاتا۔

دفتر کے کام میں غلطیاں پکڑی جانے لگیں اور پہلے نرم اور پھر گرم لہجے میں اس سے باز پرس ہونے لگی تو ہندسوں اور عددوں کو جمع کرنے کی عادت اور بھی پختہ ہو گئی اسے کوئی نمبر پلیٹ نظر نہ بھی آتی تو وہ خود ہی اعداد فرض کر لیتا اور ان کو جمع کرتا۔ ضربیں دیتا رہتا۔ دل ہی دل میں فرضی اعداد کے عادِ اعظم اور جذر نکالتا رہتا۔ مکان نمبر ہو یا ٹیلیفون نمبر وہ ہندسوں کو جمع کرنے یا ان کے ذواضعاف اقل نکالنے پر خود کو مجبور پاتا بچوں کی تعلیم کے اخراجات، چائے کا بل، گھر کا خرچ۔ قرضے کی قسطیں، مہنگائی اور بیوی سے لڑائی جھگڑا ——— !

ان سب پریشانیوں سے بچنے کے لئے وہ ہندسوں کے جنگل میں پناہ لیتا۔ ہندسوں کے علاوہ اس کا کسی بات پر اختیار نہیں تھا۔ ہندسے ہی اس کے مونس و غمخوار تھے معصوم اور وفادار ہندسے وہ چاہتا تو انہیں جمع کر دیتا۔ چاہتا تو ان کو ضربیں دیتا ہندسوں نے کبھی شکایت نہ کی تھی۔ دفتر میں اس نے اپنے پلّے سے چائے پینا کم کر دی تھی، وہ دوسرے لوگوں کو چائے کے لئے پھانستا اور اس کے بدلے ان کا دیا ہوا ڈھیروں کام دفتر بند ہو جانے کے بعد بھی کرتا رہتا۔

اس نے چند ایک بار اپنی ترقی کے لئے اپیل بھی کی مگر باس نے بلا کر اس کی توجہ کام میں غلطیوں کی طرف دلائی اور ڈانٹ ڈپٹ کر خاموش کر دیا۔ مگر اب جمیلہ سے اچانک ملاقات کے بعد اسے امید کی کرن نظر آنے لگی تھی۔ اس کے بہنوئی کے با اثر ہونے اور اس کے اختیارات کا اندازہ لگانے کے بعد اس کے دل میں ہری ہری کونپلیں

پھوٹنے لگی تھیں اسے ایسا محسوس ہونے لگا تھا۔ جیسے اس کے اندر کے کمپیوٹر کو زنگ لگ چکا تھا۔ اور اب اس کی اوور ہالنگ ہو رہی تھی۔ جمیلہ اب بھی خوبصورت تھی۔ اور شاید اب بھی اسے چاہتی تھی۔ یقیناً وہ اس کی دُکھ بھری روداد سن کر اس کی مدد کرے گی اور اس کی برسوں سے رُکی ہوئی ترقی ہو جائیگی۔ ترقی سے تنخواہ میں اضافہ کے خیال سے اسے خوشگوار خیالوں نے آگھیرا اور وہ طرح طرح کے چھوٹے چھوٹے منصوبے بنانے لگا۔

اس نے کئی روز تک جمیلہ کے ہاں جانے کی تیاری کی ایک چھٹی کے روز شیو بنا کر نہا دھو کر اور اجلے کپڑے پہن کر اسے ملنے کے لئے گھر سے روانہ ہوا

بچپن کی حسین یادوں اور جمیلہ کی دلنشین مسکراہٹوں کے تصور سے اس کے دل میں محبت اور چاہت کے بگولے اٹھنے لگے اور وہ ان کے ساتھ اڑتا چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے لئے وہ بالکل بھول گیا کہ وہ شادی شدہ ہے۔ اس کے بہت سے بچے ہیں۔ اس کا آدھا سر سفید ہو گیا ہے اور وہ جمیلہ کے ہاں اپنی محکمانہ ترقی کے سلسلے میں سفارش کے لئے جا رہا ہے۔ اسے صرف اتنا یاد تھا۔ جمیلہ اب بھی نہایت حسین تھی اور بیس برسوں کے بعد بھی وہ اسے محبت اور اپنائیت سے ملی تھی۔ مگر کچھ ہی دیر بعد جب بگولوں کی گرد بیٹھی اور وہ جذبات کے جھکڑوں سے باہر آیا تو اسے یہ سوچ کر دھچکا سا لگا۔ کہ وہ جمیلہ کے ہاں ملازمت میں ترقی کے سلسلے میں جا رہا ہے اس کو اپنے آپ سے گھن سی آئی۔ وہ پریشان ہو گیا۔ اور پریشانی سے بچنے کے لئے اس نے حسبِ معمول ہندسوں کی جمع تفریق شروع کر دی وگن سے اتر کر سیکٹر ایف ۸ فور کی طرف جاتے ہوئے اس نے سوچا کہ اگر مکان نمبر ۸۱۹ پہلے اور گلی نمبر ۲۷ بعد میں لکھا جائے تو عدد ۸۱۹۲۷ بنتا ہے اور اگر اس کے برعکس گلی نمبر پہلے اور مکان نمبر بعد میں لکھا جائے تو عدد ۲۷۸۱۹ بنتا ہے پھر نجانے کیوں اس نے ان دونوں کسروں کا فرق ۵۴۱۰۸ نکال لیا۔ لیکن پھر اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اس حاصلِ تفریق کا کیا کرے۔ اس نے ذہن پر بہت زور دیا۔ مگر اسے بالکل یاد نہ آیا کہ ۵۴۱۰۸

روپے تھے ٹیلیفون نمبر تھا۔ یا کسی کے گھر کا پتہ اور اس کا کیا کرنا تھا۔ شاید سب کچھ زیرو زیرو ہو چکا تھا۔

اس واقعہ کو کتنی برس گذر چکے ہیں

وہ ملازمت سے ریٹائر ہو چکا ہے۔ اس کے دو بڑے بچوں کی شادیاں ہو چکی ہیں اسے بہت کچھ یاد ہے۔ لیکن اسے جمیلہ کے گھر کا پتہ بھول گیا ہے۔ فارغ اوقات میں وہ لیٹ کر پہروں یاد کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ لیکن اسے یاد نہیں آتا

ببول سے لپٹی ہوئی بیل

بس روانہ ہوئی تو میں نے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔

پکی سڑک بن جانے کی وجہ سے راستہ بدلا ہوا ضرور نظر آتا تھا مگر سڑک سے ہٹ کر وہی میرے دیکھے بھالے کھیت اور درخت تھے۔ البتہ بعض چھوٹے درخت بڑھ کر تناور پیڑ بن گئے تھے اور بعض تناور پیڑ بوڑھے اور ٹنڈ منڈ ہو گئے تھے۔ میرے ذہن میں یادوں کی فلم سی چلنے لگی۔

یہ بیریوں کا جھنڈ ہے جہاں ہم سالانہ امتحانوں کے بعد بیر کھانے آیا کرتے تھے یہ سیم نالہ ہے جہاں ہم مچھلیاں پکڑتے تھے۔ یہ نہر کا پل ہے جہاں حسینو جلاہے سے میری لڑائی ہو گئی تھی اور اس نے تختی مار کر مجھے زخمی کر دیا تھا۔ یہ سائیں نظام دین کا مزار ہے یہاں میں نے آٹھویں جماعت کے وظیفے کے امتحان کے لیے منت مانی تھی۔ بچپن کے ساتھی۔ ان کی باتیں، شرارتیں، باہمی لڑائیاں اور محبتیں، ماں باپ کی شفقتیں، ماسٹر شاہنواز کی جھڑکیاں، خرگوشوں کا شکار، کبڈی کے اکھاڑے اور تاجی۔

اس کا زیادہ تر وقت اپنی ماں کے ساتھ کھیتوں کھلیانوں اور ویرانوں میں گزرتا تھا ان کے اپنے کھیت تھے نہ کوئی کمانے والا۔ وہ جنگل سے لکڑیاں چنتی رہتیں۔ اپنی بکری کے لیے ٹہنیاں اور چارہ اکٹھا کرتی رہتیں۔ کسان فصلیں اٹھا کر لے جاتے تو وہ کھیتوں

میں گرے پڑے گندم یا دھان کے خوشے چُنتی رہتیں۔ کبھی لانی کی جھاڑیاں کاٹنے نہر پار والے کلر میں چلی جاتیں۔ ان جھاڑیوں کی راکھ سے وہ کپڑے دھونے کے صابن کا کام لیتیں۔ جب ہم چھوٹے تھے تو کئی بار اس کی ماں کے منع کرنے کے باوجود میں بھی ان کے ساتھ چلا جاتا تھا۔ اس کی ماں عجیب و غریب قسم کی چیزیں جمع کرتی رہتی۔ ساگ پات کی گٹھڑی سی باندھ لاتی۔ پوہلی کو جھاڑ کر اس کے بیج نکالتی جسے وہ بھٹی میں بھون کر مزے سے کھاتیں۔ کبھی گاؤں میں کوئی جانور ذبح کیا جاتا تو وہ اوجھڑی، آنتیں اور پھیپھڑے اٹھا لاتیں۔ بیروں، جنگلی شہتوتوں، تالابوں میں اگی کمیتوں اور آندھی سے گرے کچے پکے آموں کے لیے کئی کئی کوس کا سفر کرتیں۔ ایسے ہی ایک سفر کے دوران ایک بار میرا پاؤں کانٹا لگنے سے زخمی ہو گیا تھا تو وہ پریشان ہو گئی تھی اور اس نے کہا تھا:

"تو اس گرمی میں ہمارے ساتھ کیوں پھرتا ہے تیرا باپ تو زندہ ہے اور پٹواری ہے۔"

مجھے یاد آیا، ماں بیٹی دونوں بہت خوددار تھیں کسی کی مدد قبول نہیں کرتی تھیں۔ کپاس چُن کر اور اُجرت پر سوت کات کات کر وقت گزارتی تھیں۔ میں کئی بار گھر سے کھانے پینے کی کوئی چیز یا پھل فروٹ لے کر گیا اور انہوں نے واپس کر دیا۔ البتہ اس نے میرے میٹرک میں پاس ہونے کے موقع پر مٹھائی کا ڈبہ نہایت خوشی سے قبول کر لیا تھا۔ ہنستے ہوئے بولی تھیں۔

"تمہاری کامیابی میں میری دُعائیں بھی شامل ہیں۔"

جن دنوں میں بی اے میں تھا اور کبھی کبھار گاؤں آتا تھا، تاجی مجھ سے میاں محمد کی سیف الملوک پڑھنے آجاتی تھی۔ ایک روز کہنے لگی۔

"ذرا اس شعر کی وہ تو کرو۔ کیا کہتے ہو تم؟"

"تشریح؟"

"ہاں وہی"

"کون سا شعر ہے"

"ہتن کھیڈن نال لے گئیوں پا گئیوں ڈونگھے فکراں
پاٹی لیر پرانی وانگوں ٹنگ گئیوں وچ ککراں"

"اس میں کیا مشکل ہے؟"

"مشکل تو نہیں مگر تم تشریح بہت اچھی کرتے ہو"

"اچھا سنو" میں نے خوش ہو کر کہا "یہ تو تمہیں پتہ ہی ہے کہ بدیع الجمال پری بہت خوبصورت تھی تمہاری طرح"

"ہاں" وہ شوخی سے بولی "میری پھوپھی جو لگتی تھی"

"جب اس کا محبوب شہزادہ اس سے بچھڑ جاتا ہے"

"تمہاری طرح" اس نے لقمہ دیا۔

"بیچ میں مت بولو" میں نے کسی معمر استاد کی طرح ڈانٹ کر کہا "تو بدیع الجمال اسے یاد کر کے کہتی ہے کہ تمہاری فرقت میں میرا کھانا پینا ہنسنا بولنا چھوٹ گیا ہے تم مجھے گہرے غموں کے حوالے کر گئے ہیں اب میری حالت اس دھجی کی سی ہے جسے جاتے وقت تم نشانی کے طور پر ببول کی کسی ٹہنی پر لٹکا گئے تھے"

میں چونک پڑا تھا وہ رو رہی تھی۔ میں نے سبب پوچھا تو گلوگیر آواز میں بولی۔

"مجھے پتہ ہے تم بھی ایک دن مجھے اسی طرح کانٹوں میں الجھا چھوڑ جاؤ گے"

مجھے یاد آ رہا تھا۔

میں شعر پڑھتا وہ دہراتی جاتی مگر جس طرح ہر مصرعہ اس کی آنکھوں میں تحلیل ہو کر ایک نئی کیفیت پیدا کر دیتا تھا اسے لفظوں کے ذریعے کسی زبان میں بیان نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کی آنکھیں بہت خوبصورت تھیں۔ اور اس کے پلکیں جھپکنے ابرو سیکڑنے اور

آنکھیں میچنے کے سینکڑوں انداز تھے۔ جب اس کی سیاہ روشن آنکھیں پوری طرح وا ہوتیں لگتا آدمی ڈوب کر اب کبھی نہ اُبھرے گا پھر وہ کسی مصرعے پہ آنکھوں کو تھوڑا سا بند کر لیتی تو شکنجے میں کسے جانے کا احساس ہوتا۔ ایک بار میرے عقب سے دھوپ کی ایک کرن آکر اس کے چہرے پہ پڑنے لگی اس نے دھوپ سے بچنے کے لیے آنکھیں نیم وا کر کے میری طرف دیکھا اور میرا دم نکل گیا۔ مجھے یاد آیا ان دنوں وہ سارے گاؤں کے دلوں پر حکومت کرتی تھی۔ جس کو جو حکم دیتی فوری تعمیل ہوتی پھر اس کے بہت سے امیدوار اور رشتہ دار پیدا ہو گئے۔ مراد ان میں سے ایک تھا۔ اس کی ماں کے بھڑکانے پر اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر غیر ذات کے پٹواری کے لڑکے کی خاطر وہ اس سے بیاہ نہیں کرے گی تو وہ دونوں کو قتل کر دے گا۔ مراد جیسے اُجڈ اور خونخوار آدمی سے ایسا اقدام کچھ بعید نہ تھا اس خیال سے کہ مجھے کوئی گزند نہ پہنچے وہ محبوب ہو گئی تھی

ایک جگہ بس جھٹکے کے ساتھ رُکی تو میرے خیالوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ میں نے دیکھا روبی میگزین پڑھ رہی تھی مگر فوزیہ بڑے انہماک سے باہر کے مناظر دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اداسی کی جھلک تھی۔ شاید اسے بھی اپنا بچپن اور بچھڑے ہوئے لوگ یاد آ رہے تھے۔ میں نے اس کے لیے دل میں ہمدردی کے گہرے جذبات محسوس کئے مگر دوسرے ہی لمحے تاجی نے پھر مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

پچھلے دنوں ہمارے وطن لوٹنے پر گاؤں سے میری پھوپھی زاد آپا ہمیں ملنے آئی تھیں اور انہوں نے دوسری باتوں کے علاوہ تاجی کے بارے میں بھی بہت سی معلومات فراہم کی تھیں اور جہاں یہ جان کر خوشی ہوئی تھی کہ وہ اب بھی میرے بارے میں پوچھتی اور یاد کرتی رہتی تھی وہاں مجھے یہ سُن کر دُکھ ہوا تھا کہ شادی کے چند سال بعد ہی وہ بھی اپنی ماں کی طرح بیوہ ہو گئی تھی اور اپنے دو چھوٹے چھوٹے بچوں کو لے کر اپنی ماں کے پاس آ گئی تھی آپا نے یہ بھی بتایا تھا کہ شوہر کی بے وقت موت سے اس پر مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑا

تھا مگر محنت مزدوری اس کی گھٹی میں پڑی تھی اس نے ہمت نہیں ہاری نہ کسی کے آگے دست سوال دراز کیا۔ مگر عسرت کی زندگی دن رات کی محنت و مشقت اور غم کی گہری دھوپ نے اُسے جھلسا کر رکھ دیا تھا۔

مجھے یاد آیا ——— میں اس کی یاد کو دل کے ٹیپ سے کبھی ایریز نہیں کر سکا تھا۔ مجھے اکثر اُداسی کے دورے سے پڑا کرتے تھے۔ فوزیہ مُنہ سے تو کچھ نہ کہتی تھی مگر جب کبھی میں ڈپریشن کا شکار ہو جاتا وہ زیادہ توجہ دینے لگتی ——— مگر پنیدے میں سُوراخ ہو تو آپ گھڑے کو کتنا ہی بھر بھر کر رکھیں۔ ضرورت کے وقت خالی ہی ملتا ہے۔ بظاہر مجھے کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ فوزیہ حسین اور تعلیم یافتہ تھی اور مجھ سے بہت محبت کرتی تھی۔ چاند سی بیٹی، معقول آمدنی اور خوبصورت گھر۔ مگر مجھے ہمیشہ کسی انجانی چیز کی کمی کا احساس رہتا تھا لگتا جیسے میرا دل خوشی کے پتے ذائقے سے خالی ہو ——— عام حالات میں میں اندرونی کیفیت ظاہر نہیں ہونے دیتا تھا مگر جب کبھی علالت کی وجہ سے قوت مدافعت کمزور پڑ جاتی تو دُکھوں کے سنپولیئے اندر کے بلوں سے جھانکنے لگتے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار مجھے سردی لگ کر بخار آ گیا تھا۔ معمولی سا بخار تھا۔ ڈاکٹر دوائی اور تسلی دے کر چلا گیا تھا مگر نصف شب کے قریب بخار تیز ہو گیا۔ فوزیہ تھوڑی دیر بعد آ کر میری مزاج پُرسی کرتی اور ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق مجھے دوا پلاتی رہی۔ پھر مجھے نیند سی آ گئی اور میں عجیب و غریب خواب دیکھنے لگ گیا۔

ایک بہت ہی باریک سا نقطہ آہستہ آہستہ بڑا ہوتا جاتا اتنا بڑا کہ ہر طرف پھیل جاتا اور میں اس کے بوجھ تلے کراہنے لگتا۔ پھر وہ سکڑنا شروع کر دیتا اور سکڑتے سکڑتے اس قدر چھوٹا ہو جاتا کہ میرا دم گھُٹنے لگتا۔ پھر مجھے عجیب و غریب شکلیں دکھائی دینے لگیں۔ سینگوں والا گھوڑا۔ دم کٹی چھپکلیاں، دو مونہے سانپ، گردن کے بغیر موٹر سائیکل چلاتا آدمی اور الاؤ کے گرد بڑے بڑے پَر پھیلا کر آگ تاپتی چمگادڑیں۔ پھر ایک بڑی سی مکھی

میرے پیچھے لگ گئی میں جتنا تیز بھاگتا وہ میرے پیچھے لپکتی آتی پھر وہ فوزیہ کا رُوپ دھار کر ہنسنے لگی۔

اس رات میں نے ماں کو کفن پہنے اپنے سے بغل گیر ہوتے دیکھا۔ پھر مٹی میں لت پت ذکیہ دکھائی دی۔

"ذکیہ تم؟"

"ہاں بھیا میں مری نہیں تھی ان لوگوں نے خواہ مخواہ مجھے دفن کر دیا تھا۔"

"اوہ ——— میری پیاری ذکیہ۔ میری جان۔ تمہیں تو بہت تکلیف ہوتی ہو گی قبر میں۔"

"بھیا تاجی کہاں ہے؟"

"تاجی؟"

"کیا آپ تاجی کو بھول گئے بھیا؟"

پھر وہ زور زور سے رونے لگی۔

میں نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں۔ فوزیہ میرے سرہانے بیٹھی تھی اور خاصی متفکر تھی بعد میں اس نے مجھے بتایا کہ مجھے ۱۰۶ درجے بخار تھا۔ اور اس نے ایمبولنس کے لیے ٹیلی فون کر دیا تھا۔

ٹھیک ہو جانے کے بعد میں نے اپنے ایک ہم وطن اور دوست ڈاکٹر سے رجوع کیا تو اُس نے مجھے دوائی کے علاوہ مشورہ دیا کہ میں وطن واپس جاؤں اور کچھ عرصہ وہاں رہ کر پُرانے واقف کاروں، رشتہ داروں اور دوستوں سے ملوں اور ان جگہوں کو دیکھوں جن کو عرصہ تک نہ دیکھنے کی وجہ سے میرا دل خوشی سے خالی ہو گیا تھا۔ میرا اپنا دل بھی وطن جانے کو چاہ رہا تھا۔ چنانچہ ہم ایک ماہ کی چھٹی لے کر آ گئے۔ مگر ہمارا بہت سا وقت شہر میں چھوٹے بھائی کے ہاں گزر گیا۔ دوسرے بہت سے

رشتہ دار اور ملنے والے بھی وہیں تھے۔

بس رُکی تو میں چونک پڑا۔ سامنے میرا گاؤں تھا۔

میں نے آپا کو خط لکھ کر آنے کی اطلاع دے دی تھی اس کا میاں اور بچے گاؤں کے بس اسٹاپ پر ہمارے منتظر تھے۔ گاؤں کے کچھ اور لوگ بھی استقبال کے لیے موجود تھے۔

ایک طویل عرصے کے بعد گاؤں کی گلیوں سے گزرتے ہوئے مجھے عجیب سا احساس ہو رہا تھا جیسے کھوئی ہوئی کوئی چیز مل گئی ہو۔ گلیوں میں آتے جاتے مردوں سے علیک سلیک کرتا اور دروازوں پر کھڑی مامیوں، پھوپھیوں اور چچیوں کو سلام کرتا اور ان کی دعائیں لیتا میں آپا کے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ میرا خیال تھا تائی بھی اپنے گھر کے دروازے پر ضرور نظر آئے گی۔ پتہ نہیں وہ کیسی ہو گی۔ اتنے طویل عرصہ کے بعد مجھے دیکھ کر اس کے جذبات کیا ہوں گے اور وہ کس طرح پیش آئے گی۔ میرا دل اسے ایک نظر دیکھنے کے لیے بے چین ہو گیا تھا لیکن اس کے گھر کا دروازہ بند تھا۔ شاید اُسے میرے آنے کی خبر نہیں تھی یا اس کی ماں نے منع کر دیا تھا۔ میرا دل بجھ سا گیا۔

آپا کے گھر کا دالان اور منڈیریں گاؤں کی عورتوں اور لڑکیوں سے بھر گئیں۔ وہ فوزیہ کے سنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں میں بہت دلچسپی لے رہی تھیں۔ آپا بہت مصروف ہو گئی تھیں۔ حقہ لوگ جاتے تھے اتنے اور آجاتے تھے۔ رات گئے تک ملنے ملانے والے لوگوں، بچپن کے دوستوں اور ہم جماعتوں کا تانتا بندھا رہا۔ مگر مجھے جس کا خاص طور پر انتظار تھا اس کا کچھ پتہ نہ تھا۔

تائی اگلے روز بھی نہیں آئی۔ اس دوران میں میں نائیوں کے گھر تعزیت کے بہانے آتے جاتے اس کے گھر کے سامنے سے بھی گزرا مگر دروازہ بند تھا۔ جی چاہا دستک دوں مگر یہ مناسب معلوم نہیں ہوتا تھا اور پھر اس کے بچے جوان ہوں گے۔ پتہ نہیں ان کا

رویّہ کیسا ہو اور وہ کیا سوچیں۔

اگلے روز ہمیں واپس آنا تھا۔ تاجی اب تک نہیں آئی تھی۔ شاید وہ مجھ سے ناراض تھی یا وہ فوزیہ سے ملنا نہیں چاہتی تھی؟ مگر کیوں؟ آپا نے تو یہی بتایا تھا کہ وہ مجھے یاد کرتی اور میرے بارے میں پوچھتی رہتی تھی۔ کیا پتہ اس کی ماں نے منع کر دیا ہو بڑھیا اب تک مجھ سے خفا ہو گی۔

جب ہم رخصت ہو رہے تھے اچانک خلاف توقع تاجی کی ماں آ گئی۔ وہ بالکل ویسی ہی تھی اس میں کچھ زیادہ تبدیلی نہیں آئی تھی۔ تاجی کو دیکھنے اور اس سے ملنے کی راہ ہموار ہوتی نظر آئی۔ میں نے اٹھ کر سلام کیا۔

"سلام خالہ"

جواب میں اس نے مجھے سر سے پاؤں تک عجیب نظروں سے دیکھا اور ٹھٹھک کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

مجھے فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا لیکن اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا وہ دوپٹے میں منہ چھپا کر روتی ہوئی واپس چلی گئی۔ مجھے عمر بھر کے لیے پشیمان چھوڑ کر!!

بیتال کتھا

بتیال بولا تم کون ہو اور مجھے کہاں لئے جاتے ہو۔
راجا کہنے لگا میرا نام راجا ہے اور میں تجھے اپنی ماں پرجارانی کے پاس لئے چلتا ہوں
اتنی بات راجا کے منہ سے سن کر بتیال کھلکھلا کر ہنسا۔ اور واپس جاکر اسی درخت پر لٹک
گیا۔ جہاں سے راجا اسے جان پر کھیل کر اتنی مشکلوں سے لایا تھا۔

راجا دیکھے تو بتیال نہیں ہے۔ بہت پریشان ہوا۔ ساری محنت اکارت جاتی معلوم
ہوئی۔ دوبارہ آسیب زدہ باغ میں جانے کا سوچ کر ہول آنے لگا۔ جہاں قدم قدم پر
خوفناک آنکھیں اور پراسرار آوازیں راستہ روکتی اور چھلاوے طرح طرح کی ڈراؤنی شکلیں بنا کر
ڈراتے دھمکاتے تھے۔ اسے وہ آندھی یاد آئی جس کے ساتھ پتھروں کی بارش ہوتی تھی۔ اور
جس کی دہشت سے پتہ پانی ہوتا اور رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ مگر پھر راجا کو اپنی بوڑھی
اور نابینا ماں کی یاد آئی جس نے عمر کا اتنا حصّہ اپنے باغ اور محل میں واپس جاکر آباد ہونے
کی آس میں گزارا اور گھڑیاں گن گن کر اس دن کا انتظار کیا تھا۔ اور راجا ارادہ باندھ،
تلوار سونت دوبارہ اس مردار کے پیچھے روانہ ہوا

پچھلی بار جب راجا باغ میں داخل ہوا تھا۔ ہر چیز کالے رنگ کی آندھی اور گرد و غبار
میں چھپ گئی تھی۔ مگر اب آندھی سرخ تھی اور ہر چیز لہولہان نظر آتی تھی۔ راجا ایک لمحے

کو ٹھٹھکا مگر پھر سنبھل کر چلنے لگا۔ تب چاروں اور سے طرح طرح کی عجیب و غریب آوازیں آنے لگیں۔ ان کو وہ پہلے بھی سن چکا تھا۔ مگر اس وقت یہ اتنی بلند، خوفناک اور ڈراؤنی نہ تھیں۔ شاید ان کم ذاتوں کو تب راجا کے پختہ ارادے کا پورا اندازہ نہیں تھا۔ مگر اب وہ اپنے تمام حربے آزما رہے تھے۔ قدم قدم پر کتے غراتے۔ بلیاں لڑتیں بھینسیں ڈکراتیں اور ہاتھی چنگھاڑتے۔ چوہے اور نیولے دوڑتے۔ بچھو ڈنک لہراتے۔ سانپ پھنکارتے اور سرسراتے۔ مگر راجہ نے ہمت نہ ہاری۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔ کہ وہ ہر قیمت پر پرجا محل اور باغ کو جسے اس کے باپ دادا نے کمال خوبی سے تعمیر کیا تھا۔ اور جس پر چنڈالوں نے قبضہ کر کے اسے اور اس کی ماں پرجا رانی کو بے دخل کر دیا تھا۔ آزاد کرا کر دم لے گا۔ تب اسی بچے کی جو پچھلی بار ہنس ہنس کر بے حال ہوتا تھا۔ جیسے اسے گدگدایا جا رہا ہو رونے کی آواز سنائی دی۔ پھر وہ چیخنے اور چلانے لگا جیسے کوئی خوفناک بھیڑیا اسے بھنبھوڑنے لگا ہو۔

ایک بار تو راجا کا دل دہل گیا مگر اس نے ادسان خطا نہیں ہونے دیئے۔ تب بہت سے لوگوں کے سسکنے، کراہنے، چیخنے اور تڑپ تڑپ کر جان دینے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ مانو کسی کا گلہ گھونٹا جا رہا ہو۔ کسی کو ذبح کیا جا رہا ہو۔ کسی کو چابکوں سے پیٹا اور ان کے اعضا کاٹے جا رہے ہوں۔ راجا نے سب سنا پر دل نہ چھوڑا۔ تلوار سے راستہ بناتا۔ پاؤں کو لپٹ لپٹ جاتے سانپوں سے چھڑاتا۔ اور قدم قدم پر بھیڑیوں کی صورت دانت نکوستے چنڈالوں کو پھلانگتا آگے بڑھتا گیا۔

کیا دیکھتا ہے کہ محل کے سامنے والے اسی درخت پر وہ خبیث پہلے کی طرح رسی سے بندھا الٹا لٹکا ہے۔ تب چاروں طرف شور مچ گیا۔ لینا پکڑنا جانے نہ پائے پھر سبھی اونچی آواز میں رونے لگے۔ خوفناک اور مکروہ صورت ڈائنیں، چڑیلیں اور چھل پیریاں سینہ کوبی کرنے لگیں۔ مگر راجہ نے اپنا دھیان نہ بٹنے دیا۔ اور آگے بڑھ کر تلوار

کا ایک ایسا بھرپور ہاتھ مارا کہ رسی کٹ گئی اور مردہ نیچے گر پڑا اور اسی پہلے کی طرح اٹھ کر بلک بلک کر رونے لگا۔ راجا نے جلدی سے چادر بچھا اس میں اسے لپیٹ کندھے پر رکھا اور لے چلا۔

تب بیتال بولا۔

"راجا تم بار بار کیوں کھیچل کرتے ہو۔ اس محنت کا کچھ فائدہ نہیں میرا جب اور جس وقت جی چاہے گا۔ واپس آجاؤں گا۔ اور اس درخت پر لٹک جاؤں گا۔"

راجا نے جواب دیا میں اس محل اور باغ کا وارث، پرجارانی کا بیٹا ہوں تم اب تک یہاں اس لئے عیش کرتے رہے۔ کہ پرجارانی بوڑھی نا بینا اور کمزور تھی۔ اور میں کمسن مگر اب میں جوان ہو چکا ہوں۔ اور میرے بازو میں قوت ہی نہیں دل میں حوصلہ اور جرأت بھی ہے۔ اور ایسا کہا ہے کہ جو آدمی اپنی جان کی پرواہ نہیں کرے گا۔ وہ اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہوگا۔

راجا کی بات سُن کر بیتال زور سے ہنسا پھر کہنے لگا۔

اے راجہ یہ محل اور باغ ہمیں بہت پسند ہے۔ ہم دو ایک بار اسے چھوڑ کر چلے بھی گئے تھے۔ مگر اس کے ہرے بھرے درخت، خوشنما پھول پودے اور ہریالی۔ خوبصورت حوض۔ عالیشان بارہ دریاں اور منقش بام و در ہمیں بہت یاد آتے۔ اور ہمارا کھنڈروں، غاروں اور قبرستان میں جی اوبھنے لگتا۔ اور ہم واپس آگئے۔ اور اب ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ہمیشہ ادھر ہی پڑے رہیں گے۔

راجا نے کہا بے شک یہ محل اور باغ عالیشان اور خوبصورت تھا۔ مگر تم بدبختوں نے اس کی کیا حالت بنا دی ہے۔ در و دیوار اندھیرے میں ڈوبے ہوتے ہیں۔ نہروں اور حوضوں کے پانی پہ کائی جمی ہے۔ جھاڑ جھنکاڑ نے خوبصورت روشوں کو چھپا دیا ہے۔ جیتے جاگتے اور زندگی سے بھرپور باغ اور محل کو تم بد ذاتوں نے قبرستان میں تبدیل کر دیا ہے۔ مگر اب

تمہیں یہاں سے نکلنا ہی ہوگا۔

بیتال بولا ـــــ راجا تم بہت نادان ہو۔ تمہیں ہماری طاقت اور حربوں کا اندازہ نہیں ہے۔ جو ہم خود نہ جانا چاہیں گے۔ تو پرجا کے تم جیسے لاکھوں کروڑوں بیٹے بھی ہمیں یہاں سے نہیں بھگا سکتے۔

یہ کہہ کر بیتال پھر چلا گیا۔ اور جا کر اسی درخت پر لٹک گیا۔

راجا بہت پریشان ہوا۔ دل میں سوچتا تھا شاید اس سے نادانی ہو گئی۔ جو وہ اسے مضبوطی سے باندھتا تو ضرور اسے اس کے حصار سے باہر لے جانے میں کامیاب ہو جاتا۔ یہ اپنے من میں سوچ، راجا پھر خالی چادر اپنے کندھے پر ڈال الٹا پھرا اور اسے درخت سے اتارا۔ اچھی طرح چادر میں لپیٹ گانٹھ لگا کاندھے پر رکھ پھر لے چلا۔

بیتال بولا۔ اے راجا۔ تم ناحق میری اور اپنی نیند خراب کرتے ہو۔ اس بیگار سے کیا حاصل۔

راجا نے کہا تم جتنی بار چاہے واپس چلے جاؤ۔ مگر میں تمہیں وہاں نہیں ٹکنے دوں گا کیوں کہ میرا ایمان ہے۔ دل سے کوشش جاری رکھی جائے۔ تو کامیابی ضرور ہوتی ہے۔ میں نے ماں سے عہد کیا ہے۔ کہ اسے پھر سے اس کے محل میں لا بساؤں گا۔ اور کوئی باطل قوت مجھے میرا عہد پورا کرنے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ کیوں کہ پرجا ماں کی سچی دعائیں میرے ساتھ ہیں۔

بیتال بولا میں تمہاری بات اور تمہارے دھن کا پکا ہونے سے خوش ہوا۔ مگر میں ایک شرط سے چلتا ہوں

راجا نے پوچھا کونسی شرط۔

بیتال بولا میں تمہیں کتھا سناتا ہوں۔ پر جو تم بیچ میں بول پڑے تو میں واپس چلا جاؤں گا۔ اور جو تم نے میری بات سن کر سوجھ بوجھ سے کام لیا اور اس کا حل ڈھونڈ لیا

تو میں پرجا محل اور باغ سے اٹھ جاؤں گا۔

راجا نے کہا مجھے منظور ہے۔

تب بیتال بولا۔ اے راجہ۔ جھناڈن نام کی ایک ندی۔ اس کے کنارے ایک چھوٹا سا نگر جس میں جسو نام کا ایک تیلی رہتا تھا۔ جسو بڑا غصیلا، خود غرض اور بدمزاج آدمی تھا بات بات پر اپنی بیوی اور بیل کو پیٹتا۔ گالیاں دیتا۔ اور ہر کسی سے الجھ پڑتا۔ غصے، بھوک اور شہوت کا غلام — جب ان میں سے کسی حالت یا کیفیت میں مبتلا ہوتا۔ جو چیز قریب یا سامنے ہوتی اسے توڑ مروڑ دیتا۔ اس کی اس عادت سے سبھی لوگ واقف تھے۔ اس لئے اس سے کتراتے تھے۔ خوف کھاتے اور دور دور رہتے تھے۔ ہر کمزور آدمی اس کی گالی یا برائی کا جواب دینے کی بجائے کنی کترا تا۔ جس سے جسو کا حوصلہ اور بڑھ گیا۔ اور اس کے مزاج میں شیخی بھی شامل ہو گئی۔ وہ جس کی چاہتا پگڑی اتار دیتا۔

ایک دن کا ذکر ہے۔ جسو گھر سے کچھ فاصلے پر کولہو پر تھا۔ اور اسے سخت بھوک لگی تھی۔ دوپہر ڈھل رہی تھی۔ کسی وجہ سے اس کی بیوی کو کھانا پکانے اور لانے میں دیر ہو گئی تھی۔ بھوک کی وجہ سے جسو کو بہت غصہ آرہا تھا۔ اور وہ بار بار بیل کو ڈنڈے مارتا اور دل میں پیچ و تاب کھاتا تھا جب تیلن ڈری سہمی کھانا لے کر آئی تو اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ چھڑی لے کر اسے پیٹنے لگا۔ وہ مار کی عادی تو ہو گئی تھی۔ مگر اس روز جسو نے اسے اس بری طرح پیٹا کہ وہ نیم بیہوش اور زخمی ہو کر زمین پر گر گئی اور کراہنے لگی۔ اس کے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹ گئے تھے۔ سفید گلابی پنڈا اور نیل نظر آنے لگے تھے۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر جسو کے پیٹ کی بھوک جاتی رہی اور ایک دوسری طرح کی بھوک نے غلبہ کیا۔ اور اس کا سارا غصہ اور برہمی شہوت میں تبدیل ہو گئی۔ عین اس وقت وہ کالی کتیا جو ہر روز اپنے پتے کے ساتھ کھانے کے وقت وہاں آجاتی تھی۔ دروازے میں آکر اکڑوں بیٹھ گئی۔ اور انتظار کرنے لگی کہ کب جسو کھانا کھائے اور کوئی ہڈی یا

یا لقمہ اس کی طرف پھینکے۔ اس دوران ڈب کھڑبا اس کا پلا کھانے کی خوشبو سونگھتا کھانے تک پہنچ گیا۔ اور کنڈوری میں منہ ڈال کر روٹی کھینچ کر مزے سے کھانے لگا۔ حسو کی نظر پڑی تو اس نے ہاتھ بڑھا کر پلے کو گردن سے پکڑا اور جلتے کو لہو میں پھینک کر چل دیا۔ کتیا اس منظر کی تاب نہ لا سکی اور وہاں سے ہٹ گئی۔

اس روز کتیا وہاں سے ہٹ گئی تھی۔ مگر جب پورے دنوں بعد حسو کے ہاں بیٹا پیدا ہوا تو وہ اکثر اس کے گھر کے گرد منڈلانے لگی۔ اور تاک میں رہتی کہ کب موقع ملے اور وہ اس کے بیٹے کو چبا کر اس سے انتقام لے

ایک دن کا ذکر ہے تیلی تیل بیچنے کہیں گیا ہوا تھا۔ تیلن گھر میں گوبر کا لیپ کر رہی تھی۔ اور بچہ پالنے میں لیٹا رو رہا تھا۔ کہ کتیا کا وہاں سے گذر ہوا۔ وہ موقع پا کر دبے پاؤں اندر آئی اور بچے کو منہ میں اٹھا کر باہر لے گئی۔ پھر وہ ایک ویران گوشے میں پہنچی اور چاہا کہ اسے چبا جائے۔ کہ بچہ قلقاری مار کر ہنس پڑا۔ پھر اس کے تھنوں، کانوں اور جبڑوں پر ہاتھ مار مار کر کھیلنے لگا۔ کتیا کو عجیب سا لمس محسوس ہوا۔ پھر اسے اس سے وہی مانوس سی باس آئی جو ڈب کھڑبے سے آتی تھی۔ تب اس کے اندر مامتا جاگ اٹھی اور اس کے سوکھے تھنوں میں دودھ اتر آیا۔ اس کے بعد سے جب بھی موقع ملتا وہ اسے دودھ پلا جاتی۔ اس کا خیال تھا۔ بظاہر وہ حسو تیلی کا لڑکا مگر اندر سے اس کا پلا تھا۔ پھر ڈب بڑا ہو گیا۔ مگر وہ اسے ایک نظر دیکھنے کے لئے حسو کے گھر کے چکر لگاتی رہتی

پھر لڑتا جھگڑتا، بات بات پر گالیاں دیتا۔ اور بیل اور بیوی کو پیٹتا حسو ایک روز بیمار پڑ کر مر گیا۔ اور ایسا کہا ہے کہ جنونی اور حسد باتی کی عمر تھوڑی ہے۔ اور حاسد اپنے غصے کی آگ میں جل کر جلد راکھ ہو جاتا ہے۔ سو حسو اپنے غصے کی آگ میں بھسم ہو گیا۔ اور تیلن بچے کو لیکر کسی دوسرے نگر چلی گئی۔ کتیا کچھ عرصہ تک انتظار کرتی رہی کہ شاید تیلن بچے کو لے کر واپس آ جائے۔ پھر مایوس ہو کر ڈھونڈنے نکلی اور نگر نگر گھومتی۔ طرح طرح کے

کتوں سے لڑتی اور مار کھاتی در بدر پھرتی رہی۔ اسی تلاش کے دوران وہ زخمی ہو گئی اور پرجا محل کے باغ میں پہنچ کر مر گئی۔

یہ سنا بیتال بولا۔ راجا اگر تم اس کے پلے تیلی کے بچے کا اتہ پتہ معلوم کر سکو تو میں تمہیں یہ مردہ لے جانے دوں گا اور پرجا باغ سے چلا جاؤں گا۔ تب تک مجھے تنگ کرنے کا کچھ فائدہ تم کو حاصل نہ ہوگا۔ یہ کہہ کر بیتال پھر چلا گیا۔ اور جا کر اسی درخت سے لٹک گیا۔

راجہ کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ واپس جا کر اسے پھر باندھ لاتے یا تیلی کے اس بیٹے کی تلاش کو نکلے۔ جو کتا تھا۔ مگر آدمی کے شریر میں رہتا تھا۔ تب راجہ کو بہت سے آدمی یاد آئے۔ جن سے مل کر یقین نہ آتا تھا۔ کہ وہ آدمی ہیں۔ آدمیوں میں کتے کو تلاش کرنا آسان جان راجا نے فیصلہ کیا کہ وہ بیتال کی شرط جیت کر واپس آتے گا۔ اور پرجا محل اور باغ کو بھوت پریت اور چنڈالوں کے قبضے سے آزاد کرائے گا۔

یہ اپنے من میں سوچ، راجا اپنے نگر آیا۔ اور ہر اس آدمی سے ملا۔ جس پر اسے یا لوگوں کو ذرا سا بھی شک ہوتا کہ ان میں آدمیت نہیں ہے لیکن بات چیت اور میل ملاپ کے بعد ہر کسی میں کوئی نہ کوئی ایسا پہلو نکل آتا۔ کہ راجہ کو اپنا خیال بدلنا پڑ جاتا۔ تب راجہ کو احساس ہوا کہ وہ جس کام کو آسان جانتا تھا۔ وہ بہت کٹھن ہے۔ ایک آدمی جو کتا تھا۔ مگر آدمیوں میں آدمی کی طرح رہتا۔ انہی کی طرح اٹھتا۔ بیٹھتا۔ کھاتا پیتا اور سارے کام کرتا تھا۔ اسے ان سے الگ کر کے پہچاننا اور ڈھونڈ نکالنا پاتال کی خبر لانے سے کم کٹھن کام نہ تھا۔ مگر راجہ نے ہمت نہ ہاری دن رات اسی فکر اور مقصد میں پھرنے لگا۔ تب اسے اس حال میں دیکھ کر ایک روز پرجا رانی نے پوچھا۔

راجا بیٹے ـــــ ماں واری ـــــ کہو کیا چنتا تمہارے من کو لگی ہے؟

راجا نے سارا ماجرہ کہہ سنایا۔ اس پر رانی کہنے لگی۔

یہ تو بڑا کٹھن کام ہے بیٹے۔ بدذاتوں نے محل اور باغ پر اپنا قبضہ قائم رکھنے کے لئے

تجھے ایسا کام سونپ دیا ہے جس کا ہونا بڑا مشکل ہے۔ ایک کتا جو آدمیوں میں رل مِل گیا ہے۔ اسے کیسے تلاش کیا جا سکتا ہے۔ پر بیٹے تو ہمت نہ ہار۔ بس تو ایسا کر کہ کتے اور آدمی کی خصلتوں پر نظر رکھ دیکھ کہ کس آدمی میں ایسی کوئی خصلت ہے جو دوسروں میں نہیں صرف کتوں میں ملتی ہے۔

راجا بولا۔ یہی تو مشکل ہے ماں — وہ کتا جو شروع دن سے آدمیوں میں رہتا ہوا انہی میں پلا بڑھا ہو اور انہی کی زبان بولتا ہو اس میں تو آدمیوں کی بھی بہت سی باتیں شامل ہو گئی ہوں گی۔ ایسے میں اسے اتنے لوگوں میں الگ کر کے کیسے پہچانوں۔

پرجا بولی، میں صدقے جاؤں۔ جو میری آنکھیں دیکھ سکتیں تو میں تیری مدد کرتی پر اب تو تو ہی میری آنکھیں ہے۔ راجا بیٹے تو دل چھوٹا نہ کر جو تو سدھ بدھ سے کام لے گا۔ تو ضرور اسے ڈھونڈ نکالے گا۔

پھر پرجا رانی نے اس کی سات موٹی موٹی نشانیاں بتائیں۔ اس نے کہا

پہلی نشانی یہ ہے کہ بات بات پر گلے پڑ جانے اور ذرا سے اختلاف پر بھڑک جانے والا آدمی ہو گا۔ کیوں کہ ایک تو وہ کتا ہے۔ دوسرے غصیلے اور شیخی خورے حسو تیلی کا بیٹا اس لئے بہت ہی کم ظرف بدمزاج اور ٹیڑھا آدمی ہو گا۔

دوسری نشانی یہ کہ غیروں کا وفادار ہو گا۔ مگر اپنوں کا بیری ہو گا۔

تیسرے یہ کہ حرص و ہوس کا پجاری ہو گا۔ اس کا پیٹ اور نیت کبھی نہیں بھرتے ہوں گے۔ کھانے اور خطرے کی بو دور سے سونگھ لیتا ہو گا۔

چوتھے یہ کہ اس کے دیدے کا پانی ڈھل گیا ہو گا۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیتا اور اپنی برائیوں پر اتراتا ہو گا۔

پانچویں یہ کہ شریف اور سہتے آدمیوں پر بلاوجہ غراتا۔ مگر جہاں کہیں سے ڈر یا فائدے کی توقع ہو گی۔ وہاں مٹل اپنی اصل کے پاؤں چاٹتا اور دم ہلاتا ہو گا۔

چھٹی یہ کہ اپنے ساتھیوں، دوستوں اور ان لوگوں کو موقع ملتے ہی نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا ہوگا۔ جنہوں نے اس سے کبھی کوئی نیکی کی ہوگی یا جو اس سے رتبے میں آگے ہونگے اور ساتویں نشانی اس کی یہ ہے کہ اس کی وفاداری مشروط اور مشکوک ہوگی۔ کیوں کہ کتے کی وفاداری در اصل ایک کھلی خوشامد ہوتی ہے جو اسے راتب ڈالتا ہے۔ اسی کے سامنے دم ہلاتا ہے۔ دوسرے کو کاٹنے کو دوڑتا ہے۔

راجا یہ سن کر پریشان ہوگیا۔ بولا

ماں یہ سب باتیں تو بہت سے آدمیوں میں ہیں۔ شاید بعض کتوں میں نہ ہوں۔ میں اسے اس طرح کیسے ڈھونڈ سکتا ہوں

پرجا بولی تو ایسے تمام لوگوں کی فہرست بنالا بیٹے یہ تیری عقل کا امتحان ہے۔ تو بدوں کی جو فہرست بنا کر لائے گا۔ اس میں وہ ضرور شامل ہوگا۔ اور ایسا کہا ہے کہ جو آدمی نیکوں کو بدوں سے اور بدوں کو نیکوں سے الگ کر کے پہچان سکتا ہے وہ بدی اور شر کو مٹانے کا اہل ہوتا ہے۔ سو جب بنیالوں بدذاتوں کو پتہ چل گیا کہ پرجا کے سوجھوان بیٹے کو سارے بدوں کا علم ہے۔ تو وہ نیکی اور سچائی کے خوف اور دہشت سے پرجا محل سے اٹھ جائیں گے۔ کیونکہ نیکی اور سچائی کا پلہ ہمیشہ بھاری ہوتا ہے۔

یہ سن راجہ بہت خوش ہوا۔ ماں کی بات پلے سے باندھ نگر نگر اور گلی گلی گھومنے لگا جہاں جہاں سنتا کوئی اندر یا باہر سے غیر آدمی لگتا ہے۔ اس کا نام پتہ لکھتا جاتا۔ اس طرح سینکڑوں ہزاروں ناموں کی ایک لمبی فہرست بن گئی۔ راجا دل میں فکر کرتا کیا پتہ وہ بدذات اس میں شامل ہوا تھا یا نہیں مگر اسے یہ سوچ کر تسلی ہوتی تھی کہ اسے نیکی اور بدی کو پہچان لینا آگیا تھا۔ اور ماں نے بتایا تھا۔ کہ برائی کو بدی سے تمیز کرنا اور جان لینا بھی نیکی ہے۔

پھر کتنے دنوں بعد ایک دن راجا نے دل میں ٹھانی کہ پرجا محل جائے۔ سو اس

نے کاغذ جیب میں ڈالا۔ تلوار اٹھائی اور جنگل کی راہ لی راستہ کٹھن اور اونچا نیچا تھا گھاٹیاں پربت دریا اور ندی نالے، خاردار جھاڑیاں اور سرکنڈے دامن پکڑتے۔ بھوت پلید راستے روکتے اور کنکر تھر پاؤں سے ٹکراتے تھے۔ مگر راجا دھن کا پکا دم لئے بغیر آگے ہی آگے بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ جب آدھی رات ادھر تھی اور آدھی ادھر۔ وہ پرجا باغ میں جا داخل ہوا۔

دیکھتا کیا ہے کہ محل میں چار سو روشنی ہو رہی ہے۔ قندیلیں جلتی اور اگر بتیاں سلگتی ہیں۔ نہر میں پانی بہتا ہے۔ جا بجا فوارے اچھل رہے ہیں۔ حوضوں میں چاند کی کرنیں ناچتی ہیں۔ اور ٹھنڈی خنک ہوا پھولوں سے کھیلتی ہے۔ راجا خوشی سے اچھل پڑا۔ بولا۔ پرجا ماں تیرا محل آباد ہو گیا۔ تیرا باغ آج سے آزاد ہو گیا۔

تب کہیں سے کالے رنگ کی ایک کتیا جس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہکتی تھیں ایک ڈب کھڑبے پلے کے ساتھ نمودار ہوئی۔ دم ہلا کر اور سر جھکا کر راجا کی اور دیکھا اور پلے کو ساتھ لئے باغ سے باہر چلی گئی۔

اوپر جلنے والا

تُوتے نے کہا۔ ان کا اپنا بھی قریب قریب یہی حال ہے مگر پانچواں، جو سب سے چھوٹا اور کمزور ہے بھوک کی شدت سے بری طرح نڈھال نظر آتا اور بار بار بے ہوش ہو جاتا ہے۔

وہ کئی روز سے اس پراسرار اور بے آب و گیاہ جزیرے میں بھٹک رہے ہیں جس کا سمندر مچھلیوں سے اور ساحل درختوں اور پرندوں سے خالی ہے۔ ان کے پاس خوراک بچی ہی کتنی تھی کہ ساتھ دیتی صرف پانی کی چھاگل رہ گئی ہے جس میں تھوڑا سا پانی ہے۔ جسے وہ قطروں کے حساب سے استعمال کرنے پر مجبور ہیں۔

وہ دن بھر خوراک کی تلاش میں گھومتے رہتے ہیں شائد کہیں کوئی شکار یا پھل دار درخت نظر آجائے جس سے وہ اپنی بھوک مٹا سکیں اور کسی امدادی جہاز یا کشتی کی آمد تک زندہ رہ سکیں مگر انہیں اب تک ہر طرف سے مایوسی ہوئی ہے۔ تاہم امید کی ایک کرن چوتھی اور آخری سمت کے سفر کی صورت ابھی باقی ہے کیا پتہ وہاں کسی قسم کی حیوانی یا نباتی خوراک مل ہی جائے مگر پانچواں اس قدر نڈھال ہے کہ دو قدم چل نہیں سکتا۔ یُوں اس کا ایک حل یہ بھی ہے کہ وہ اسے اس کے حال پر چھوڑ کر آگے

بڑھ جائیں مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا کیونکہ انہیں موت سے زیادہ تاریخ میں بُرے ناموں سے یاد کئے جانے سے ڈر لگتا ہے۔

کچھ دیر کی سوچ بچار کے بعد وہ اُسے ایک جھلنگے میں ڈال لیتے ہیں اور اُسے چاروں کونوں سے پکڑ کر اپنے ساتھ اٹھائے اٹھائے پھرنے لگتے ہیں۔ تھکاوٹ غالب آجاتی ہے تو کچھ دیر سستا لیتے ہیں پھر رہی سہی طاقت جمع کر کے دوبارہ چلنے لگتے ہیں۔ انہوں نے باہمی رضامندی سے اپنی پانی پینے کی مقدار اور گھٹا دی ہے اور اپنے حصّے کی بوندیں بھی جھلنگے میں پڑے نیم بے ہوش پانچویں کے حلق میں ٹپکاتے رہتے ہیں۔

چلتے چلتے دوپہر ہو جاتی ہے۔ سورج پوری شدت سے چمکنے لگتا ہے اور پاؤں تلے کی بھربھری ریت اور مٹی دہکنے لگتی ہے مگر وہ ہمّت نہیں ہارتے۔ کیا پتہ چوتھی کھونٹ کھانے پینے کو کچھ مل ہی جائے۔

ان کے پاؤں میں آبلے پڑ جاتے ہیں اور بدن جُھلس کر سیاہ ہو جاتے ہیں مگر وہ اُسے اٹھائے گرتے پڑتے چلتے رہتے ہیں تب اچانک ان کی نظر ایک ہرے بھرے درخت پر پڑتی ہے جو دور سے ناریل کا پیڑ نظر آتا ہے۔

اُس لمحے جب چھاگل میں بہت تھوڑا پانی اور بدنوں میں برائے نام طاقت رہ گئی ہے ویرانے میں اکیلا کھڑا یہ ہرا بھرا درخت انہیں ایک بڑے نخلستان کی طرح معلوم ہوتا ہے مارے خوشی کے وہ چھاگل کی بچی کھچی ساری بوندیں نیم ہوش پڑے پانچویں کے حلق میں ٹپکا دیتے ہیں جس سے وہ نہ صرف ہوش میں آجاتا ہے بلکہ اس میں اتنی توانائی آجاتی ہے کہ اٹھ کر اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جاتا ہے

ناریل کے پیڑ کی طرح نظر آنے والے اس درخت کا پھل بھی ناریل جیسا نظر آتا ہے لذیذ، خوش ذائقہ اور رس سے بھرا ہوا۔ مگر اتنے بڑے پیڑ پر گنتی

کے چند پھل نظر آتے ہیں اور اس پر چڑھنا اور پھل توڑ کر لانا تقریباً ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ پریشان ہو کر وہ ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگتے ہیں مگر پانچواں جو اب سب سے زیادہ تر و تازہ اور چاک و چوبند نظر آتا ہے آگے بڑھ کر کہتا ہے۔

"میں اوپر جاؤں گا اور سب کے لئے پھل توڑ کر لاؤں گا۔"

"نہیں تم نہیں" دوسرا بزرگانہ شفقت سے کہتا ہے "تم چھوٹے اور کمزور ہو میں خود جاؤں گا۔"

"اگر تم چاہو تو میں جاتا ہوں" تیسرا کہتا ہے۔

"شاید تم لوگ بھول گئے" پانچواں کہتا ہے "ایسے درختوں پر چڑھنے کی مجھے تربیت دی گئی ہے۔"

"ہاں یہ تو ہے" دوسرا کہتا ہے "مگر تم چھوٹے اور نحیف ہو ہم ڈرتے ہیں تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچے ہم واپس جا کر کیا منہ دکھائیں گے۔"

"تم بالکل فکر نہ کرو" پانچواں کھمبے کی طرح کھڑے درخت کے چکنے اور گول تنے کا جائزہ لیتے ہوئے کہتا ہے "بس کسی طرح مجھے پہلی ڈال تک پہنچا دو اس کے بعد اوپر جانا آسان ہو جائے گا۔"

"میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی ہے" چوتھا کہتا ہے "اگر ہم چاروں ایک دوسرے کے اوپر کھڑے ہو کر ایک سیڑھی سی بنا دیں تو پانچواں آسانی سے پہلی ڈال تک پہنچ سکتا ہے۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔"

"ٹھیک ہے بہت اچھی ترکیب ہے مگر ہم میں سے کس میں اتنی ہمت ہے کہ سب کا بوجھ سہارنے کے لئے پہلے نمبر پر کھڑا ہو"

سارے چپ ہو جاتے ہیں۔

"قرعہ اندازی کرلیں"؟

"قرعہ اندازی کی نہیں یہ تو ہمت اور حوصلے کی بات ہے"

"میں نیچے کھڑا ہوں گا" پہلا پیش کش کرتا ہے۔

"اس کے بعد میں" دوسرا کہتا ہے۔

"اس کے بعد میرا نمبر ہوگا"، تیسرا کہتا ہے۔

"ظاہر ہے اس کے بعد میرا" چوتھا کہتا ہے۔

ایک دوسرے کی ہمت بڑھاتے اور خصوصاً پہلے کو داد شجاعت دیتے ہوئے وہ رہی سہی طاقت جمع کر کے پیڑ کے تنے سے لگ جاتے اور ایک دوسرے کے اوپر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

پانچواں چھاگل نچوڑ کر حلق تر کرتا اور نہایت پھرتی سے ان کی کمروں اور کندھوں پر پاؤں جماتا اوپر چڑھنے لگتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے پہلی ڈال تک جا پہنچتا ہے۔ پہلی سے دوسری اور پھر تیسری ڈال پر قدم رکھتا وہ بلند ہوتا جاتا ہے۔

وہ ایک دوسرے کے کندھوں سے اتر کر اپنے اپنے کندھے اور پسلیاں سہلاتے اور پانچویں کے چوٹی پر پہنچنے کا انتظار کرنے لگتے ہیں مگر پہلا اب تک اپنی جگہ درخت کے تنے کے ساتھ لگا کھڑا ہے اور پیچھے ہٹنے کا نام نہیں لیتا شائد اس لئے کہ وہ کسی کے کندھے پر سوار نہیں ہوا کہ کوئی اسے اپنا کندھا جھٹک کر نیچے اترنے کو کہتا۔ وہ زمین پر کھڑا ہے اور زمین کبھی کندھے جھٹک کر نہیں گراتی۔ آدمی خود گر جائے تو بھی اسے پناہ دیتی ہے۔ سو زمین نے اسے پناہ دی۔

وہ خوف اور صدمے سے ایک عجیب دہشت ناک منظر دیکھتے ہیں پہلا ـــــ گھٹنوں تک زمین کے اندر دھنسا ہوا ہے اور اب اُسے اوپر سے پھینکے جانے والے پھل کا انتظار ہے نہ اس کا ذائقہ جاننے کی آرزو ـــــ

وہ پریشانی میں تھوڑی دیر کے لئے اوپر والے کو بھول جاتے ہیں۔ پہلے کو مٹی سے باہر نکالتے اور پھر مٹی ہی میں دبا دیتے ہیں۔ اس کی شجاعت اور ایثار کو سراہتے اور اس کی نیکیوں کو یاد کرتے ہیں۔ پھر دوسرا اوپر منہ کر کے دکھ بھرے لہجے میں کہتا ہے۔

"وہ جس نے ہم سب کا بوجھ اپنے ناتواں کندھوں پر اٹھایا اب ہم میں نہیں رہا۔"

"ہاں — اب ہم تین رہ گئے ہیں ہم بھوک سے نڈھال اور پیاس سے بے حال ہیں زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتے"

مگر پانچواں کوئی جواب نہیں دیتا۔

اسی لمحے کوئی چیز نیچے گرتی ہے وہ بیتابی سے لپکتے ہیں مگر یہ دیکھ کر ان کے مرجھائے ہوئے چہرے اور مرجھا جاتے ہیں کہ وہ ناریل ایسے پھل کا لکڑی کی طرح خشک اور سخت چھلکا ہے۔

اُوپر سے گرائے جانے والے پھل کا انتظار کرتے کرتے شام ہو جاتی ہے اور سمندر کی طرف سے ہولناک اندھیرا امنڈنے لگتا ہے مگر پانچواں پھل نیچے گراتا ہے نہ ان کی کسی بات کا جواب دیتا ہے۔ اوپر دیکھ دیکھ کر ان کی آنکھیں اور گردنیں تھک جاتی ہیں اور پکار پکار کر ان کے گلے خشک ہو جاتے ہیں۔

"کہیں پھر بے ہوش نہ ہو گیا ہو"؟

"پھل زہریلا بھی تو ہو سکتا ہے اسے کچھ ہو نہ گیا ہو"؟

"کیا پتہ پیٹ بھر کر کھا پی لینے سے اسے نیند آ گئی ہو گذشتہ کئی دنوں سے مارے بھوک اور پریشانی کے ہم میں سے کوئی سویا بھی تو نہیں اور پھر نیند تو سولی پر بھی آ جاتی ہے"۔

اسی لمحے لکڑی کی طرح سخت اور خشک چھلکے پھران کے قریب گرتے ہیں جنہیں وہ چکھ اور سونگھ کر پھینک دیتے ہیں۔

"وہ خود کھا پی رہا ہے۔"

"کھا لینے دو ـــــ اس میں طاقت اور توانائی آئے گی تبھی وہ ہمارے لئے پھل توڑ سکے گا۔"

"ہاں اس کی طاقت ہماری طاقت ہے۔"

"مجھے تو شک ہے" دوسرا کہتا ہے۔

"کس بات کا؟" تیسرا پوچھتا ہے مگر دوسرا کوئی جواب نہیں دیتا۔ اس پر غشی طاری ہو جاتی ہے۔

وہ اُسے ہوش میں لانے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ ہوش میں نہیں آتا دیکھتے ہی دیکھتے اس کی گردن ایک طرف کو ڈھلک جاتی ہے۔

تیسرا اور چوتھا خوفزدہ نظروں سے اُسے دیکھتے ہیں پھر اسے کھینچ کر پہلے کی قبر کے پاس ڈال دیتے ہیں شاید اب ان میں قبر کھودنے کی بھی ہمت نہیں رہی۔ پھر چوتھا گھبرا اور گڑگڑا کر اوپر والے کو اطلاع دیتا ہے۔

"سنو اب ہم دو رہ گئے ہیں اگر تم نے جلدی نہیں کی تو ہم بھی نہیں بچ سکیں گے۔"

"تم ٹھیک تو ہو پانچویں؟" تیسرا پوچھتا ہے۔

"ہاں میں ٹھیک ہوں" پہلی بار اوپر سے پانچویں کی آواز سنائی دیتی ہے۔

وہ خوشی اور امید بھری نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔

تیسرا کہتا ہے۔

"اگر تم ٹھیک ہو تو ہمارے لئے کچھ پھینکتے کیوں نہیں ہو؟"

"پھل بہت تھوڑے اور دُور دُور ہیں ان کا توڑنا بہت مشکل ہے میں

صبح کوشش کروں گا۔"

"ہم میں صبح تک انتظار کرنے کی ہمت نہیں پانچویں۔ خدا کے لئے جلدی کچھ کرو"

"کیا تم چاہتے ہو" پانچواں خفگی سے کہتا ہے "اندھیرے میں پھل توڑنے کی کوشش میں، میں پھسل کر نیچے گر جاؤں"

"نہیں" چوتھا کہتا ہے تمہاری سلامتی ہماری سلامتی ہے تم کوئی خطرہ مول نہ لو ـــــ ہم صبح ہونے کا انتظار کریں گے"

"کچھ فائدہ نہیں" تیسرا سرگوشی کرتا ہے "اس کی نیت اوپر پہنچتے ہی خراب ہو گئی ہے اب یہ حیلے بہانوں سے ہمیں یونہی ٹالتا اور ہمارے مرنے کا انتظار کرتا رہے گا دیکھ لینا"

"آہستہ بولو" چوتھا کہتا ہے "اس نے سن لیا تو برا مان جائیگا اب ہم اس کے رحم وکرم پر ہیں"

"اس سے بھی کچھ فرق نہیں پڑے گا"

"مجھے معلوم ہے لیکن ہمیں تحمل سے کام لینا چاہیئے اور اسے ناراض نہیں کرنا چاہیئے کیا پتہ؟"

"کیا تمہیں یاد ہے کہ وہ لمبی دوڑوں میں حصہ لیتا رہا ہے؟"

"ہاں مجھے معلوم ہے لیکن لمبی دوڑوں کا اس وقت کیا ذکر؟"

"لمبی دوڑ جیتنے کا ایک گر یہ بھی ہے کہ مقابلے کے آخری لمحوں یا چکر کے لئے کچھ توانائی بچا کر رکھی جائے"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ جب ہم اسے بے ہوش اور نڈھال سمجھ کر جھلنگے میں اٹھائے

پھرتے رہے تو اس نے آخری چکر کے لئے اپنی توانائی بچالی۔"

"تمہارا خیال ہے وہ اتنا نڈھال اور بے ہوش نہیں تھا؟"

"ہاں — یہ اس کی چالاکی تھی۔"

"شاید تم ٹھیک ہی کہتے ہو مجھے یاد آرہا ہے جب ہم بڑے ٹیلے کے پاس دم لینے کو رُکے تھے۔ میں نے اسے کن انکھیوں سے اپنی طرف دیکھتے دیکھا تھا مگر اس وقت مجھے بالکل خیال نہیں آیا تھا کہ وہ بے ہوش ہونے کی اداکاری کر رہا ہے"

"میرا خیال ہے درخت پر گنے چنے پھل ہیں اور امدادی جہاز یا کشتی کے آنے میں زیادہ دن بھی لگ سکتے ہیں اسی خیال سے پانچویں کی نیت میں فتور آگیا ہے۔ اور اب یقیناً وہی اکیلا امدادی جہاز کا استقبال کرے گا"

"پھر کیا کریں؟"

"پہلے کی ہمت اور حوصلے کو یاد کریں اور مایوس نہ ہوں کیا پتہ وہ صبح کو اپنا وعدہ پورا کردے"

"ہاں اس کے سوا ہم کر بھی کیا سکتے ہیں"

تیسرا اور چوتھا ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر قریب قریب لیٹ جاتے ہیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ایک دوسرے کی نبض یا سانس ٹٹول لیتے ہیں لحظہ لحظہ رات ڈھلتی اور صدیوں بعد صبح طلوع ہوتی ہے۔

"تیسرے تم کیسے ہو؟"

"میں ٹھیک ہوں اور تم"

"میں بھی ٹھیک ہی ہوں"

"کیا سوچ رہے ہو؟"

"سوچ رہا ہوں اگر آج بھی اس نے اپنا وعدہ پورا نہ کیا تو ہم بھی جلد ہی"

"سنو" تیسرا کہتا ہے "شاید وہ پھل توڑ رہا ہے"

"ہاں" چوتھا کہتا ہے "تم اسے آواز دو"۔۔۔

"نہیں ۔۔۔ وہ تمہاری بات مانے گا" تیسرا کہتا ہے "تم اُسے آواز دو"

"پانچویں" چوتھا آواز دیتا ہے "صبح ہو گئی اپنا وعدہ پورا کرو"

پانچویں کی آواز سنائی دیتی ہے۔

"پھل تھوڑے ہیں ہمیں کفایت سے کام لینا ہوگا بس تم شام تک انتظار کرو"

شام کا نام سن کر دونوں دہل جاتے ہیں۔ پھر ایک کہتا ہے۔

"شام تک ہم مر چکے ہوں گے پانچویں۔ ہم پر رحم کھاؤ"

"میں شام کو اپنا وعدہ پورا کر دوں گا مجھے پریشان نہ کرو"

"اوّل تو ہم شام تک زندہ نہیں ہوں گے" تیسرا کہتا ہے اور اگر زندہ بچ بھی گئے تو بھی یہ اپنا وعدہ پورا نہیں کرے گا"

"تم ٹھیک کہتے ہو" چوتھا کہتا ہے "اس کی نیت واقعی خراب ہے"

"آہ ہم اسے اٹھائے اٹھائے پھرے اسے اپنے حصّے کا پانی پلاتے اور اپنی رہی سہی توانائی خرچ کرتے رہے اسے کندھوں پر سوار کر کے اوپر پہنچایا اور اب وہ ہمیں سسک سسک کر مرتے دیکھ رہا ہے"

"طوطا چشم" تیسرا کہتا ہے۔

"میں سن رہا ہوں" پانچویں کی آواز سنائی دیتی ہے "تم مجھے برا بھلا کہہ رہے ہو"

"میں تمہارا خون پی جاؤں گا" تیسرا اب تک غصّے میں ہے۔

"پاگل کے بچّو" پانچواں کہتا ہے "اگر تم مجھے گالی نہ دیتے تو شاید مجھے تم پر ترس آجاتا مگر تم خود بھی مرنا چاہتے ہو"

" ایسا نہ کہو پانچویں" چوتھا کہتا ہے" اسے معاف کردو۔ بھوک پیاس کی شدّت اور موت کے خوف سے ہم واقعی پاگل ہو رہے ہیں"

" معافی مانگو"

تیسرا معافی مانگتا ہے۔

" ایسے نہیں" پانچواں کہتا ہے" ناک رگڑ کر"

" مجھ میں ناک رگڑنے کی سکت نہیں" تیسرا کہتا ہے" دیکھ میں ہاتھ جوڑتا ہوں مجھے معاف کردو"

" اگر تم ناک سے لکیریں نہیں نکال سکتے تو مجھے افسوس ہے میں شام کو بھی تمہارے لئے کچھ نہ کر سکوں گا"

" میں کوشش کرتا ہوں" تیسرا زمین پر ناک رگڑنے کے لئے جھکتا ہے۔

" ایسا نہ کرو" چوتھا کہتا ہے" پہلے کی شجاعت کو یاد کرو اس نے جان دیتے وقت اُف تک نہیں کی تھی"

" بھوک اور پیاس نے میری ہمّت کو پست کر دیا ہے مجھے پستی اور بلندی میں کوئی فرق محسوس نہیں ہو رہا"

" یہ زوال ہے" چوتھا کہتا ہے مگر تیسرا جھکتا چلا جاتا ہے۔

جھکنے سے تیسرے کی پھٹی ہوئی جیب سے کوئی چیز باہر آگرتی ہے۔

" ارے یہ تو چاقو ہے" چوتھا خوشی سے کہتا ہے" ٹھہر جاؤ ناک رگڑنے کی ضرورت نہیں"

" تم کیا کرنا چاہتے ہو"؟ تیسرا ڈر کر پیچھے ہٹ جاتا ہے۔

" ڈرو نہیں — ہم اس سے درخت کو کاٹیں گے"

" اتنے چھوٹے سے چاقو سے یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم اتنا بڑا درخت کاٹ کر گرادیں"

"ہاں یہ مشکل اور صبر آزما کام ہے لیکن تم نے کبھی ہُدہُد کو دیکھا ہے. جو اپنی چونچ سے"

"ہاں دیکھا ہے"

"یہ تو پھر چاقو ہے۔ لوہے کا بنا ہوا اور آدمی کے ہاتھ میں ہے"

"ہاں یہ تو ہے"

"پھر ہمارا مقصد محض درخت گرانا نہیں"

"پھر؟"

"کیا یہ بہتر نہیں کہ ہم ناک یا ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے کی بجائے امدادی جہاز یا ملک الموت کے آنے تک اپنی جدوجہد جاری رکھیں۔ اور نہیں تو اوپر والا ہم سے ناکیں تو نہیں رگڑوا سکے گا اور تب تک بے فکری کی نیند تو نہیں سو سکے گا"

"ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔ ایسے حالات میں پستی سے بچنے کے لئے اب یہی ایک راستہ رہ گیا ہے"

"مگر میں سوچتا ہوں تیسرے ایسا کرنے سے ہمارے اور پانچویں میں کیا فرق رہ جائے گا؟"

"وہی جو توتے اور ہدہُد میں ہوتا ہے"

"نہیں — ہم ایسا نہیں کر سکتے" چوتھا کہتا ہے "ورنہ ہم تاریخ کو اور پہلے کو کیا منہ دکھائیں گے؟"

"پھر؟"

"پھر ہمیں انتظار کرنا ہوگا جب تک کہ سکیں کہ یہی ہمارا مقدر ہے"

"پھر کیا ہوا میاں مٹھو؟" میں پوچھتا ہوں۔ مگر توتا میری بات کا جواب دیئے بغیر اڑ کر ایک اونچے ڈال پر جا بیٹھتا ہے اور پھل کتر کتر کر کھانے لگتا ہے۔

اگلی صف کا آدمی

ہمیں پہلے ہی دیر ہو رہی تھی۔ اوپر سے ہر ٹریفک سگنل راستہ روک لیتا۔

چھوٹا کہنے لگا۔ "جب پہلا سگنل بند ملے تو پھر سارے سگنل بند ہی ہوتے ہیں"

"یہ ضروری تو نہیں ہے۔" میں نے بے چینی سے پہلو بدل کر کہا۔ "مگر آج ایسا ہی لگ رہا ہے"

"کہیں ہم گاڑی سے نہ رہ جائیں"۔ وہ بولی

"گاڑی کی فکر نہ کریں جی" ڈرائیور نہایت اطمینان سے سگریٹ سلگا کر کہنے لگا "گھنٹوں کے حساب سے لیٹ ہوتی ہیں"۔

"اور اگر آج گاڑی وقت پہ آگئی تو؟"

"ابھی کافی وقت ہے۔" ڈرائیور نے کہا۔ "آپ اطمینان رکھیں"

ہم نے اطمینان کا سانس لینا چاہا مگر اگلے چوک پہ پھر رکنا پڑا کیونکہ سگنل بند تھا۔

یہاں گاڑیوں کی اتنی لمبی قطار لگی ہوتی تھی۔ کہ اگر ٹریفک سگنل کھلا بھی ملتا تب بھی ہم بتی سرخ ہو جانے سے پہلے اس تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اور جب تک بتی سرخ سے سبز ہوتی ہمارے دائیں بائیں آگے پیچھے چھوٹی بڑی گاڑیوں۔ بسوں۔ رکشاؤں ریڑھیوں اور ٹرکوں کی قطاریں لگ گئیں۔ ٹریفک سگنل یہاں سے کافی فاصلے پہ تھا۔ مگر اس کی بتیاں نظر آ رہی تھیں جو باری باری سرخ اور ہری ہوتی رہیں مگر ٹریفک حرکت نہیں کر رہا تھا۔ سبھی لوگ اپنی

اپنی جگہ بے چین تھے۔ ہارن بج رہے تھے۔ انجن چل رہے تھے۔ مگر سب اپنی اپنی جگہ رُکے کھڑے تھے۔

ہم بار بار گھڑیاں دیکھتے اور پریشان ہوتے۔ وقت تیزی سے گذر رہا تھا۔ مگر کوئی گاڑی آگے نہیں بڑھ رہی تھی۔ ادھر گاڑیوں کی دوہری تہری قطاروں کے درمیان خالی جگہوں پر موٹر سائیکل اور سکوٹر سوار گھسے چلے آتے تھے۔

ڈرائیور نے سر باہر نکالا اور دائیں جانب والے ٹرک ڈرائیور سے جو نسبتاً آسانی سے چوک کی طرف دیکھ سکتا تھا۔ پوچھا مگر اسے خود اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ کہ ٹریفک جام ہونے کی کیا وجہ ہے۔ پھر وہ بائیں جانب والی بس کے ڈرائیور سے مخاطب ہوا۔

"استاد کیا گڑبڑ ہے؟"

"چوک میں شاید کوئی گاڑی خراب ہو گئی یا الٹ گئی ہے۔"

"اف خدایا" وہ بولی "اب کیا ہو گا؟"

"وہی ہو گا جو منظور خدا ہو گا۔" چھوٹے نے خوش دلی سے جواب دیا۔

"کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔ بی بی جی" ڈرائیور نے کہا۔ "گھبرانے کی ضرورت نہیں ابھی سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

"چوک میں شاید کوئی حادثہ ہو گیا ہے" ہمارے پیچھے والے ریڑھا مزدور نے تیز دھوپ میں کھڑے کھڑے اپنے کسی ساتھی کو بتایا۔

حادثے کا نام سن کر چھوٹا بولا "پھر تو بڑی دیر ہو جائے گی۔"

"حادثہ نہیں جی" ڈرائیور بولا "رش کا وقت ہے۔ یہاں کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔"

اسی لمحے چوک کی طرف سے دو آدمی گاڑیوں کے درمیان میں سے راستہ تلاش کرتے ہوئے آئے ہمارے قریب سے گزرتے ہوئے ایک کہنے لگا۔

"انجن بند کر کے مزے سے آرام کریں استاد"

"ہاں بے شک کچھ دیر سو لیں" دوسرا بولا

"کیا کوئی حادثہ ہو گیا ہے؟"

نہیں استاد ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی ضد میں گاڑیاں پھنس گئی ہیں۔"

ہم اور زیادہ پریشان ہو گئے۔ ظاہر تھا کہ وہاں سے جلدی نکلنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اس کے ساتھ ہمیشہ یہ مسئلہ رہتا ہے کہ وہ معمولی سی بات پر نروس ہو جاتی ہے۔ اور انتظار کے لمحوں میں تو بہت ہی بے چین اور مضطرب ہو جاتی ہے۔ میں نے اسے تسلی دی۔

"کوئی بات نہیں اگر ایک گاڑی چھوٹ گئی تو ہم دوسری ٹرین سے چلے جائیں گے۔"

"دوسری ٹرین سے؟"

"ہاں کیا ہوا — جہاں رات گیارہ بجے پہنچنا ہے۔ وہاں دو گھنٹے لیٹ پہنچ جائیں گے"

"یعنی کل کی تاریخ میں؟"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے"

"فرق کیوں نہیں پڑتا — آپ کو تو پتہ ہے۔ ہمارا آج کی تاریخ میں پہنچنا کتنا ضروری ہے"

"ان سب لوگوں کو جو یہاں رکے کھڑے ہیں۔ کہیں نہ کہیں جلدی اور ضروری پہنچنا ہے"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر بڑی مشکل پڑ جائے گی۔"

"پھر کیا کیا جائے"

"کیوں نہ اتر کر پیدل چلیں" چھوٹا کہنے لگا "چوک سے آگے جا کر دوسری ٹیکسی لے لیں گے۔

"یہ ٹھیک کہتا ہے" وہ بولی "مگر سامان کا کیا ہو گا"

"تھوڑا تھوڑا سب اٹھا لیتے ہیں" چھوٹے نے جواب دیا۔

چنانچہ ہم نے ایسا ہی کیا۔ ٹیکسی کا کرایہ ادا کر کے اور ڈرائیور سے معذرت کرتے ہوئے

ہم سامان اٹھا کر چل دیئے۔ مگر آگے پیدل جانے کا راستہ بھی مسدود ہو چکا تھا۔ ناچار ہم پچھلے چوک کی طرف روانہ ہوئے ہم نے پروگرام بنایا کہ پچھلے چوک سے ایک دوسرے راستے سے ہوتے ہوئے اسٹیشن پہنچنے کی کوشش کریں۔

اتفاق سے ہمیں دوسری ٹیکسی آسانی سے مل گئی۔ اور ہم متبادل راستے پر چل پڑے۔ مگر تھوڑی دور جانے کے بعد پتہ چلا کہ یہ سڑک بھی ٹریفک رکنے سے بند ہو چکی ہے۔ مگر ہم نے ہمت نہ ہاری اور نہ ہی ٹیکسی کے بڑھتے ہوئے کرایہ کی پرواہ کی اور ایک تیسرے راستے سے جو خاصا طویل تھا۔ اسٹیشن کا رخ کیا۔ مگر بدقسمتی سے ہم اس میں بھی کامیاب نہ ہو سکے۔ ٹریفک منجمد ہونے کے اثرات یہاں تک پھیل چکے تھے۔ چنانچہ ہم واپس اس مقام پر آ گئے جہاں سے ٹریفک کھلنے کی صورت میں فاصلہ کم پڑتا تھا۔ اور جہاں سے ہم نے دوسری ٹیکسی لی تھی۔ مگر اب یہاں بھی ٹریفک کا دباؤ تھا۔ اور ہر لمحے گاڑیوں کی لمبی قطاریں مزید لمبی ہوتی جا رہی تھیں۔ اب ہماری پہلی ٹرین یقیناً نکل چکی تھی۔ شاید ہم دوسری گاڑی پکڑ سکیں اس اُمید کے ساتھ ہم ٹیکسی میں بیٹھ کر ٹریفک کے حرکت میں آنے کا انتظار کرنے لگے۔

"اس سے بہتر ہے کہ ہم رات کو دیر سے پہنچیں" وہ بولی "سفر ہی ملتوی کر دیا جائے"

"اب تو واپسی کا راستہ بھی بند ہو چکا ہے" ڈرائیور نے اطلاع دی

"تو کیا ہم واپس گھر بھی نہیں جا سکتے" چھوٹا بولا۔

"بہت مشکل ہے برخوردار" ٹیکسی ڈرائیور نے جواب دیا

"مجھے تو لگتا ہے ہم دوسری گاڑی بھی نہیں پکڑ سکیں گے"

"ہاں کچھ ایسے ہی حالات ہیں۔ ممکن ہے ہمیں آخری گاڑی سے جانا پڑے"

"اوہ میرے خدا" وہ اور پریشان ہو گئی۔ یہ تو بہت تکلیف دہ بات ہے۔

اب صورتِ حال یہ تھی۔ کہ تمام شہر کا ٹریفک منجمد تھا۔ اور ہر سڑک اور بازار میں ہر لمحے گاڑیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اور جس طرح دریا بہتا ہے تو وہ دریا رہتا ہے

رک جائے تو جھیل کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اور سیلاب بن کر سب کچھ ڈبو دیتا ہے۔ اسی طرح ٹریفک چلتا رہتا ہے تو پتہ نہیں چلتا۔ کہ کتنی سینکڑوں گاڑیاں گزر گئیں۔ مگر جب ایک پل کے لئے بھی رک جائے تو پھر کئی طرح کی دوسری خرابیاں اور پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں ہر کوئی جھنجھلایا ہوتا ہے اور ایک دوسرے میں گھسا چلا آتا ہے۔ بعض گاڑیوں کے انجن بند ہو جائیں تو دوبارہ اسٹارٹ نہیں ہوتے۔ اگر ٹریفک کھل جائے تو بھی ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی وجہ سے کنفیوژن اور الجھاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر یہاں تو ٹریفک کے حرکت میں آنے کے آثار دور دور تک نظر نہ آتے تھے۔ بعض ڈرائیوروں نے سڑک کے بیچ جہاں وہ تھیں گاڑیاں بند کر دی تھیں اور خود کسی دوسرے ڈرائیور یا جاننے والے سے گپ شپ لڑانے چلے گئے تھے۔ بعض نے قریبی چائے خانوں کا رُخ کیا تھا۔ خود ہمارا ٹیکسی ڈرائیور فرصت پاکر شپو بنوا آیا تھا۔ آج گرمی بھی اپنے عروج پر تھی۔ بسوں۔ ویگنوں سوزوکیوں اور کاروں میں ٹھنسے ہوتے لوگوں کا مارے گرمی، حبس اور پیاس کے بُرا حال ہو رہا تھا۔ دھوئیں اور ڈیزل کی بدبو نے فضا کو اور بھی مکدر کر دیا تھا۔ انجنوں اور ہارنوں کے شور سے کان پھٹ رہے تھے۔ ٹریفک پولیس کے سپاہی جگہ جگہ بے نتیجہ سیٹیاں بجا رہے تھے۔ مجھے ان مزدوروں کا خیال آ رہا تھا۔ جن کی دیہاڑی ماری گئی تھی اور ان مریضوں کا جو ہسپتال نہیں پہنچ سکے تھے۔ وہ بار بار تھرموس سے پانی پی رہی تھی۔ مگر چھوٹا تھک کر اب اونگھ رہا تھا۔ مجھے خیال آ رہا تھا کہ اگر اس وقت ہوائی جہاز سے شہر کا نظارہ کیا جاتے تو کیسا خوفناک منظر دکھائی دے۔ ایسا معلوم ہو جیسے سارا شہر ساکت و جامد ہو گیا ہے۔

ہم نے ایک ریڑھی والے سے پھل خریدا پھر ڈرائیور سے کہہ کر قریبی ریستوران سے چائے منگائی۔ مگر تھکاوٹ اور بوریت کم نہ ہوئی البتہ جس طرح رنج سے خوگر ہونے سے رنج کا احساس مٹ جاتا ہے اس طرح وہ مسلسل مضطرب رہنے کے بعد اب قدرے پرسکون ہو گئی تھی۔ اس دوران ہم نے کئی بار سامان اٹھا کر پیدل گھر واپس جانے کا ارادہ کیا مگر

ایک تو فاصلہ بہت تھا۔ دوسرے تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد ٹریفک میں ہلچل پیدا ہو جاتی اور امید بندھ جاتی کہ شاید اب ٹریفک رواں ہونے والا ہے۔

پھر ہمارے قریب کھڑی منی بس کے ڈرائیور کا کوئی جاننے والا بڑے چوک کی طرف سے پیدل چلتا ہوا آیا اور اس نے اطلاع دی کہ سڑک جلد ہی صاف ہو جائے گی اور ٹریفک حرکت میں آجائے گی۔

"چکر کیا تھا بھائی؟"

"کوئی خاص بات نہیں تھی استاد ــــ بس ایک شخص نے ٹریفک کے اصولوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے زبردستی اپنی گاڑی آگے بڑھا دی دوسری طرف سے گاڑیاں پہلے ہی آگے بڑھ چکی تھیں۔ اسے ریورس کرنے کو کہا گیا۔ مگر اس نے ایک نہ سُنی اور جب تک ٹریفک پولیس مداخلت کرتی ریورس کرنا ناممکن ہو گیا تھا۔ کیوں کہ ہر طرف گاڑیوں کی لمبی قطاریں لگ چکی تھیں۔

"کمال ہے" وہ بڑبڑائی۔ "صرف ایک شخص کی وجہ سے سارے شہر کا ٹریفک جام ہو گیا"

"ہر واقعہ کا محرک کوئی ایک شخص ہی ہوتا ہے۔ وہ آگے ہوتا ہے۔ یا اگلی صف میں ہوتا ہے۔ اسی سے پہل ہوتی ہے۔"

"ایسے شخص کو سخت سزا ملنی چاہیئے۔ جو اپنے ساتھ دوسروں کو بھی بے ڈوبتا ہے۔"

"ابو" چھوٹا پچھلی سیٹ پر آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ اور بولا۔ "ہم تو وہیں ہیں جہاں صبح تھے۔"

"ہاں بیٹا" وہ بولی جہاں اصولوں کی خلاف ورزی ہوتی ہو وہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔ کوئی بھی کہیں نہیں پہنچ سکتا یا سب کو دیر ہو جاتی ہے۔"

اچانک ٹریفک میں پھر ہلچل پیدا ہو گئی۔ ایک بار پھر انجن سٹارٹ ہو گئے۔ ہارن بجنے لگے اور ٹریفک پولیس کے سپاہیوں کی وسلیں سنائی دینے لگیں اور ہم آخری ٹرین پکڑنے کی اُمید میں ایک بار پھر بیتابی سے ٹریفک کھلنے کا انتظار کرنے لگے

ایندھن

اس کا ذہن بیدار ہوتا ہے تو وہ یہ سوچ کر خوش ہوتا ہے کہ وہ زندہ ہے۔ زندگی اور موت میں بس یہی فرق ہے کہ آدمی سوچ سکتا ہے یا نہیں سوچ سکتا۔ وہ آنکھیں کھولنا چاہتا ہے مگر پپوٹوں پر بوجھ محسوس ہوتا ہے اور کوشش کے باوجود آنکھیں نہیں کھلتیں۔ تاہم اُسے یہ جان اور محسوس کر کے کہ اس کی آنکھیں اس کے ساتھ اور سلامت ہیں اطمینان ہوتا ہے۔ کان لگا کر سُنتا ہے۔ اپنے سانس کے چلنے کی آواز سُنائی دیتی ہے۔ باری باری دونوں بازوؤں کو حرکت دیتا اور جاننے کی کوشش کرتا ہے کہ اس کے بازو سلامت ہیں۔ اس کا مطلب ہے۔ اُوپر کا دھڑ جس میں بازو لگے ہیں اب تک موجود ہے مگر نچلا دھڑ؟ — کوشش کے باوجود اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اُسے یاد آتا ہے آخری بار جب دھماکے کی آواز اس کے کانوں میں آئی تھی اس کے ساتھ ہی کوئی چیز اس کے اندر پیوست ہو گئی تھی اور وہ ہوا میں اُچھلا یا شاید پاتال میں گرتا چلا گیا تھا۔ اس کے ذہن میں آخری خیال اپنے مرنے کا آیا تھا اور اس نے بغیر کسی رنج یا خوشی کے سوچا تھا کہ وہ مر رہا ہے اس وقت اسے مطلق خیال نہیں آیا تھا کہ وہ کیوں اور کس کے ہاتھوں مر رہا ہے اسے اپنا کوئی دوست یا رشتہ دار بھی یاد نہیں آیا تھا یا شاید اس کی فرصت اور مہلت ہی نہیں ملی تھی کہ وہ کسی کو یاد کر سکتا۔ اُسے نہیں معلوم کہ مرنے کے خیال اور زندہ ہونے کے احساس کے درمیان

وقت نے کتنا فاصلہ طے کیا تھا۔ اُسے یاد آتا ہے تب شاید سہ پہر کا وقت تھا۔ دھماکوں اور پرندوں کی آوازوں کا شور فضا میں پھیلا ہوا تھا اور اگرچہ روشنی تھی مگر دھوئیں اور بلند قامت درختوں کے سایوں کی وجہ سے زیادہ دُور کی چیزیں صاف نظر نہ آتی تھیں اور گھنے جنگل اور پہاڑوں نے ابھی سے دھوپ اور روشنی کا راستہ روک دیا تھا مگر اب اس کے مقابلے میں ہر طرف خاموشی ہے۔ البتہ کبھی کبھی کسی جانور کے بولنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ یقیناً رات ہو چکی ہو گی اور عارضی طور پر لڑائی رُکی ہوئی ہو گی۔

اچانک اس کے پاؤں میں درد کی لہر اٹھتی ہے اور وہ خوش ہوتا ہے کہ اس کا پاؤں بھی موجود ہے۔ آہستہ آہستہ وہ اپنے پورے جسم کو محسوس کرنے لگتا ہے۔ یہ بائیں ٹانگ اور پاؤں۔ یہ دایاں گھٹنا اور یہ _____ اس کی کنپٹی میں سوئے ہوئے درد کی ٹیس جاگتی ہے وہ ہاتھ بڑھا کر اسے ٹٹولتا ہے۔ کنپٹی پر گہرا زخم ہے وہ گھبرا اور چونک کر آنکھیں کھول دیتا ہے۔

اس کی آنکھیں چوپٹ کھلی ہیں مگر اسے کچھ دکھائی اور سجھائی نہیں دیتا تو کیا اس کی بصارت؟ مگر نہیں آنکھیں سلامت ہیں اور ان میں درد ہے نہ جلن۔ شاید تاریکی بہت ہے اندھیرا زیادہ ہو تو آنکھیں سلامت ہوں تب بھی کچھ نظر نہیں آتا۔ یقیناً اماوس کی رات ہو گی کیا پتہ آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوں یا وہ کسی تاریک اور گہرے گڑھے میں پڑا ہو اُسے یاد آتا ہے۔

اس نے اپنے ساتھیوں سے مل کر بہت سے گڑھے کھودے تھے۔ تو کیا وہ اپنے ہی کھودے ہوئے کسی گڑھے میں گر گیا؟ لیکن یہ تو دشمن کے لیے کھودے گئے تھے۔ کیا پتہ یہ دشمن کا کھودا ہوا کوئی گڑھا ہو وہ بھی تو اپنے دشمن کے لیے کئی روز سے کھود رہے تھے مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ گڑھا کس نے کھودا۔ جب آدمی کھود رہا ہوتا ہے اسے پتہ نہیں ہوتا کہ وہ دراصل کس کے لیے کھود رہا ہے اسے تو بسا اوقات

یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کیوں کھود رہا ہے۔ اصل سوال تو یہ ہے کہ آدمی آدمی کے لیے گڑھا کیوں کھودتا ہے۔ وہ کسی دوسرے کو ہلاک کرنا کیوں چاہتا ہے اور اسے اپنے جیسے دوسروں سے خطرہ کیوں ہے مگر اس وقت شاید اہم سوال یہ ہے کہ اگر یہ گڑھا ہے چاہے دشمن کا کھودا ہوا یا اپنا۔ اس سے باہر کیسے نکلا جائے اور اگر اس علاقے پر دشمن کا قبضہ ہو چکا ہے تو باہر نکل کر کیا کیا جائے۔ اسے خیال آتا ہے کہ جب تک روشنی نہ ہو جس میں دوست دشمن کی تمیز ہو سکے۔ گڑھے سے باہر نہیں نکلنا چاہیئے مگر اس کا تو کوئی دوست اور دشمن نہیں البتہ اس کی بندوق سے گولیاں نکلتی رہی ہیں کیا پتہ کسی کو کوئی لگ گئی ہو اور وہ مر گیا ہو یا اسی کی طرح کسی گڑھے میں پڑا کراہ رہا ہو۔ اسے خوف سا آنے لگتا ہے۔ اگر ایسا ہوا ہے تو وہ خود کو کیا جواب دے گا؟ اچانک روشنی کی ایک لکیر سی اس کی نگاہوں کے سامنے جھلملاتی ہے مگر دوسرے ہی لمحے پھر تاریکی چھا جاتی ہے اسے اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ واقعی ایک گہرے کھڈ میں پڑا ہے جس کے کنارے اونچے ہیں اور اس کے آس پاس کوئی موجود ہے۔ شاید دشمن کے آدمی ؟ ممکن ہے دشمن اپنے آدمیوں کی لاشیں اٹھا رہا ہو مگر کیا پتہ دشمن کی بجائے یہ اپنے کسی آدمی کی ٹارچ کی روشنی ہو۔ کتنی عجیب بات ہے کہ روشنی سے اندازہ نہیں لگایا جا سکتا کہ وہ دشمن کی ٹارچ سے نکلی ہے یا دوست کی۔ یہی صورت گولی کی ہے۔ دوست اور دشمن اور قصوروار اور بے قصور میں تمیز نہیں کرتی۔ آپ دشمن کی بندوق چھین کر اسی سے اس کو ہلاک کر سکتے ہیں۔ پتہ نہیں جہاں گولیاں بنتی ہیں۔ وہاں کسی کو خیال آتا ہو کہ ان گولیوں سے کون اور کیسے لوگ ہلاک ہو سکتے ہیں کتنے خواب ویران ہو سکتے ہیں اور کتنے بچے یتیم ہو سکتے ہیں۔ شاید ہی کبھی کسی نے کوئی گولی ہاتھ میں لے کر اس شخص کا تصور کیا ہو جس کے سینے، دل یا دماغ میں وہ پیوست ہونے والی ہوتی ہے۔ خود چلانے والے کو اکثر پتہ نہیں ہوتا کہ وہ جسے ہلاک کر رہا ہے وہ کون اور کیسا ہے۔ اس کا نام کیا ہے عمر کتنی

ہے۔ شکل وصورت کیسی ہے اور اسے زندہ رہنے کی کتنی خواہش اور ضرورت ہے۔ اُسے تو صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ دشمن کی صف کا آدمی ہے اور بس۔ اسے تو بسا اوقات دشمنی کا سبب بھی معلوم نہیں ہوتا۔ اسے حکم ملتا ہے اور فائر کھول دیتا ہے اور نہیں جانتا وہ گولیاں کسی کو لگ بھی رہی ہیں یا نہیں۔ اور اگر لگ رہی ہیں تو کس کس کو اور کہاں کہاں اور ان پہ کیا بیت رہی ہے۔ اگر وہ ان سب کو جنہیں وہ ہلاک کر رہا ہوتا ہے اچھی طرح جانتا ہو ان کے نجی حالات، مجبوریوں، آرزوؤں اور خوابوں سے واقف ہو تو شاید گولی چلانے میں تامل کرے مگر نہیں ایسا کیسے ہو سکتا ہے حکم کی تعمیل تو بہرحال کرنا ہوتی ہے اسی کا نام ڈسپلن ہے اور اسی کی تربیت دی جاتی ہے تو قصوروار کون ہے۔ حکم دینے والا یا تعمیل کرنے والا وہ جس قدر سوچتا ہے۔ اتنا ہی الجھتا چلا جاتا ہے۔ پھر اسے پاؤں کی ٹیس اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے وہ اٹھ کر بیٹھ جاتا اور ٹٹول کر پاؤں کے زخم کو چھوتا اور اندر سے گولی نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ درد کی شدت سے اسے چکر آنے لگتے ہیں وہ خود کو سنبھالنے کی بہت کوشش کرتا ہے مگر نہیں سنبھال سکتا۔

کیا دیکھتا ہے ایک چبوترے پہ اسٹیج بنا ہے جس کے سامنے تماشائی بیٹھے ہیں۔ بائیں جانب وردی میں ملبوس ایک افسر ہاتھ میں ڈنڈا لئے۔ کرسی پر بیٹھا ہے۔ حوالدار سیلوٹ مارتا ہے۔ افسر پوچھتا ہے۔

"کیا خبر ہے؟"

"سر دشمن نے پھر حملہ کر دیا ہے۔ ہمارے بہت سے آدمی کام آگئے ہیں ہمیں مزید آدمیوں کی فوری ضرورت ہے۔"

"نئی بھرتی کا کیا ہوا؟"

"جاری ہے سر لیکن۔"

"لیکن کیا؟"

"سر جوان آدمی نہیں ملتے۔"

"جوان آدمی نہیں ملتے تو بوڑھوں کو بھرتی کرو۔ سکولوں میں جاؤ۔"

"سر تقریباً تمام صحت مند بوڑھوں کو بھرتی کیا جا چکا ہے اور انہیں ٹریننگ دی جا رہی ہے۔ سکولوں کے اعلیٰ درجوں کو بھی بھرتی کر لیا گیا ہے۔"

"یہ اعلیٰ اور ادنیٰ کی کیا بکواس ہے۔"

"سر میرا مطلب ہے کم از کم بندوق تو اٹھا سکتے ہوں۔"

"چھوٹی بندوقوں کا آرڈر دے دو منی گنز۔ انڈر سٹینڈ!"

"یس سر۔"

"اور یہ کون ہے؟" افسر اس کی طرف اشارہ کر کے پوچھتا ہے۔

"سر یہ وہی آدمی ہے جو سکول کے بچوں کو روکتا اور خود بھی رضامند نہیں ہوتا۔"

"رضامندی ضروری نہیں ہے۔"

"سر رضامندی کے بغیر ——— میرا مطلب ہے تعاون تو ضروری ہے ورنہ کیا فائدہ؟"

"دشمن سے ملا ہوا ہے؟"

"نہیں سر ہم نے انوسٹیگیٹ کر لیا ہے اس کے مغز میں خرابی معلوم ہوتی ہے۔"

"اسے ٹریننگ دے کر محاذ پر بھجوا دیا جائے خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔"

"حضور میں لڑنا نہیں چاہتا۔" وہ کہتا ہے "مجھے لڑائی جھگڑے سے وحشت ہوتی ہے۔ میں کسی کا خون کرنا نہیں چاہتا میں نے آج تک کسی کی جان نہیں لی صرف ایک بار مرغی ذبح کی تھی اس کا تڑپنا اور پھڑکنا مجھے آج تک نہیں بھولا۔"

افسر ہنستا ہے اور دلچسپی لیتے ہوئے کہتا ہے۔

"آدمی اتنا بزدل بھی ہو سکتا ہے میں نے کبھی سوچا نہیں تھا۔"

"میں بزدل نہیں مہذب آدمی ہوں۔"

"مہذب یا احمق؟" افسر قہقہہ لگاتا ہے۔

"میرا ایک اور مسئلہ بھی ہے حضور؟"

"کیا مسئلہ ہے؟"

"میرے سامنے کوئی غلط کام کیا جائے کسی سے زیادتی یا بے انصافی کی جائے تو خود بخود میری نکسیر پھوٹ جاتی ہے۔"

"یہ کیا بکواس ہے حوالدار؟"

"یہ ٹھیک کہتا ہے سر۔ بہت کمزور دل کا آدمی ہے اس کے سامنے کوئی ایسا کام کیا جائے جو اسے پسند نہ ہو تو اس کی نکسیر پھوٹ جاتی ہے اور خون زیادہ بہہ جائے تو یہ بکری کا بچہ بے ہوش ہو جاتا ہے۔"

"سچ سچ بتا دو تم کون ہو اور اصل بات کیا ہے۔" افسر پوچھتا ہے۔

"میں ایک امن پسند شہری ہوں۔ بچوں کو پڑھاتا ہوں اور پڑھانا چاہتا ہوں۔ میں جنگ سے نفرت کرتا ہوں اور بچوں کو اس کا ایندھن بنتے نہیں دیکھ سکتا۔"

"کیا اپنی سرزمین کا دفاع کرنا میرا تمہارا ہم سب کا فرض نہیں ہے؟"

"میرا کام بچوں کو پڑھانا اور انہیں اچھا شہری بنانا ہے۔"

"کیا تم جانتے ہو کہ دشمن تمہارے سکول کو آگ لگا سکتا اور تمام بچوں کو ہلاک کر سکتا ہے۔"

"مگر کیوں؟"

"اس لیے کہ وہ دشمن ہے۔"

"دشمن دشمن کیوں ہے؟"

"یہ جاننا تمہارے لئے ضروری نہیں ہے اور نہ تمہاری کھوپڑی میں یہ بات

آسکتی ہے!"

"کیا میرا کام صرف حکم کی تعمیل کرنا ہے اور وہ بھی جانے بوجھے بغیر؟"

"ہاں یہی ہمارا فیصلہ ہے۔"

"میں اس فیصلے کو نہیں مانتا۔"

"تمہیں حکم کی تعمیل کرنا ہوگی۔"

"میں گولی نہیں چلا سکتا۔ میں کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ میں کسی سے زیادتی کروں تو وہ کیفیت خود مجھ پر طاری ہو جاتی ہے۔"

"کیا بکتے ہو؟"

"میں سچ کہتا ہوں۔ ایک دفعہ بچپن میں، میں خرگوش کا شکار کرنے والے شکاریوں اور کتوں کے ہمراہ گیا تھا۔ وہ منظر مجھے آج تک یاد ہے۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے وہ خرگوش میں خود تھا۔ میں پوری طاقت سے بھاگ رہا تھا مگر کتوں کی تھوتھنیاں ہر لمحے میرے قریب تر آتی جا رہی تھیں اس وقت بے بسی کی جو کیفیت میں نے محسوس کی تھی وہ اذیت میری روح کا حصہ بن گئی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں نے میدان جنگ میں کسی کو ہلاک ہوتے دیکھ لیا تو مر جاؤں گا۔"

"ابھی تمہارا امتحان کرتے ہیں۔" افسر کہتا ہے پھر حوالدار سے مخاطب ہوتا ہے۔

"حوالدار۔"

"یس سر۔"

"ایک بے قصور آدمی تلاش کرو۔ اور اُسے اس کے سامنے کوڑے لگاؤ۔"

"ویری ویل سر۔"

حوالدار اِدھر اُدھر دیکھتا ہے پھر اسٹیج سے اُتر کر تماشائیوں کے پاس آتا ہے اور باری باری ہر ایک کے پاس جاتا ہے۔ اپنی باری پر ہر تماشائی اپنی نشست

سے کھڑا ہوتا اپنے جُرم اور گناہ کا اعتراف کرتا اور اس کی نوعیت بتاتا ہے ۔

نمبر۱ : میں جیب کُترا ہوں ۔

نمبر۲ : بردہ فروش ۔

نمبر۳ : قاتل ۔

نمبر۴ : چوری، ڈکیتی، رسّہ گیری ۔

نمبر۵ : پڑوسی کے کم سن بچّے سے بدفعلی . . . . .

نمبر۶ : ناپ تول میں ڈنڈی مارتا ہوں ۔

نمبر۷ : ملاوٹ، ذخیرہ اندوزی، سُود خوری ۔

نمبر۸ : قمار بازی ۔

نمبر۹ : اپنے مزارعوں اور ہاریوں کو پورا حصّہ نہیں دیتا ۔

نمبر۱۰ : میں بہت ہی بُرا آدمی ہوں اپنی سگی بھانجی . . . . .

نمبر۱۱ : امانت میں خیانت ۔

نمبر۱۲ : میں پنچائت کا رُکن ہوں ۔ میں نے کئی بار غلط فیصلوں کی تائید کی ہے ۔

نمبر۱۳ : رشوت، غبن ۔

نمبر۱۴ : جھوٹی گواہی ۔

نمبر۱۵ : میں نے اپنے دوست کی بیوی سے جو مجھے بھائی سمجھتی اور مجھ پر اعتماد کرتی تھی زبردستی کی ۔

نمبر۱۶ : سمگلنگ ۔

نمبر۱۷ : عورتوں اور منشیات کا اڈہ چلاتا ہوں ۔

نمبر۱۸ : مزدوروں کی تنخواہوں سے اپنا کمیشن کاٹتا ہوں ۔

نمبر۱۹ : میں خدا کے ساتھ دھوکا کرتا رہا ہوں ۔ مجھے عبادت کے مخصوص اور اصل

الفاظ بھول گئے ہیں مگر میں ایک عرصہ سے عبادت کی اداکاری کر رہا ہوں۔

نمبر۲۰ : مجھے جھوٹ بولنے کی عادت ہے۔

نمبر۲۱ : حضور میں ایک حاسد آدمی ہوں کسی کو خوش نہیں دیکھ سکتا۔ میں نے تصور میں کئی لوگوں کو قتل کیا ہے لیکن شاید یہ بات میرے گناہگار ہونے کا کافی ثبوت نہ ہو لیکن حضور میری سازشوں سے کئی لوگوں کو نقصان پہنچ چکا ہے۔

نمبر۲۲ : جناب میں نے کبھی کوئی گناہ نہیں کیا البتہ میں سچ کو چھپاتا اور اس کا بروقت اظہار کرنے سے ہچکچاتا رہا ہوں۔

نمبر۲۳ : "میں تو بہت ہی گناہگار ہوں حضور۔ میں علم کے نام پر جہالت اور تعصب کا پرچار کرتا رہا ہوں۔"

حوالدار مایوس ہو کر واپس پلٹتا ہے اور کہتا ہے۔

"سر یہ سارا ہال ایسے ہی لوگوں سے پٹا پڑا ہے۔ اب کیا کیا جائے۔ اگر آپ اجازت دیں تو اسی کی پتلون؟"

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں" افسر کہتا ہے "جس نے جو جرم کیا ہے اسے اس کے علاوہ کسی دوسرے جرم میں پکڑ کر سزا دو۔"

"ویری گڈ سر ــــ یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔"

اس کی ناک سے خون بہنے لگتا ہے۔ قمیض کا سامنے کا حصہ سرخ ہو جاتا ہے مگر اسی لمحے اس کی آنکھ کھل جاتی ہے۔

کیا دیکھتا ہے کہ صبح کا اجالا پھیل رہا ہے۔ گڑھے کے اوپر سے دکھائی دیتا آسمان کا ٹکڑا ابر آلود ہے۔ وہ اوپر دیکھتے رہنا چاہتا ہے مگر اسے ڈر لگتا ہے کہیں دشمن کا کوئی آدمی اچانک کنارے پر آکر کھڑا نہ ہو جائے اور اس کی زندہ اور چمکتی ہوئی آنکھیں دیکھ کر اسے گولی سے نہ اڑا دے۔ مگر جب کافی دیر تک کوئی آہٹ سنائی نہیں دیتی تو

وہ دوبارہ آنکھیں کھول کر اوپر دیکھنے لگتا ہے۔ اسے خواب یاد آتا ہے اور وہ ٹٹول کر دیکھتا ہے اور حیران ہوتا ہے اس کے نتھنوں کے سامنے واقعی خون کی پپڑیاں جمی ہوئی ہیں پھر کنپٹی اور پاؤں میں درد کی ٹیسیں جاگتی ہیں اور وہ کراہنے لگتا ہے۔ اسی لمحے درخت کی اس شاخ پر جو اسے لیٹے لیٹے نظر آ رہی ہے۔ رنگین پروں والی ایک خوبصورت چڑیا آ کر بیٹھ جاتی اور صبح کی تازہ ہوا کے جھونکوں میں شاخ کا جھولا جھولنے لگتی ہے۔ اُسے چڑیا پر رشک آتا ہے۔ کم از کم اسے زبردستی کسی جنگ میں لڑنے کے لیے بھرتی نہیں کیا جا سکتا مگر اسے یاد آتا ہے۔ کل جب جنگ زوروں پر تھی۔ دھماکوں سے پرندے کس قدر پریشان تھے۔ یقیناً وہ دانہ دنکا بھی نہیں چگ سکی ہوگی۔ پھر اسے مہلک کیمیائی اور ایٹمی ہتھیاروں اور بموں کا خیال آتا ہے جن کے پھٹنے سے ہر قسم کی حیوانی اور نباتاتی زندگی بھی بھسم ہو سکتی ہے۔ اسے یاد آتا ہے کہ سائنسدانوں نے ایسے بم ایجاد کر لئے ہیں جن کے پھٹنے سے ساری ہوا مسموم ہو جائے گی اور ہر ذی روح کا دم گھٹ جائے گا اور انسان ہی نہیں تمام چرند پرند بھی فوراً ہی مر جائیں گے۔ معصوم اور بے خطا چرند پرند۔ دم گھٹنے کے خیال سے اس کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ وہ خود کو سنبھالنے کی بہت کوشش کرتا ہے مگر اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھاتا چلا جاتا ہے پھر اس اندھیرے سے عجیب سا منظر اُبھرتا ہے۔ کیا دیکھتا ہے کہ میچ شروع ہو چکا ہے ــــ

نیلی اور پیلی یونیفارم پہنے دونوں ٹیموں کے کھلاڑی فٹ بال کے آگے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔ وہ منہ میں وِسل لئے ساتھ ساتھ بھاگ رہا ہے۔ فٹ بال کبھی ایک طرف کی ڈی میں چلی جاتی ہے کبھی دوسری میں۔ نیلی یونیفارم میں اس کی اپنی کلاس کے بچے بہت عمدہ کھیل کا مظاہرہ کر رہے ہیں لیکن اچانک فٹ بال کو چھوڑ کر دونوں ٹیمیں ایک دوسری پر جھپٹ پڑتی ہیں۔ وہ بار بار وِسل بجاتا ہے مگر وہ الگ نہیں ہوتے ایک دوسرے کو ناخنوں سے نوچتے اور دانتوں سے کاٹتے اور بھنبھوڑتے ہیں

وہ انہیں قریب آ کر منع کرنا چاہتا ہے مگر وہ باؤلے پلوّں کی طرح آپس میں گتھم گتھا ہیں اور اس کی ایک نہیں سُنتے۔ اسے یہ جان کر حیرت ہوتی ہے کہ پیلی یونیفارم میں بھی اس کی اپنی کلاس کے وہی بچے ہیں جو نیلی یونیفارم میں ہیں۔ یونیفارم کے رنگ کے علاوہ ان میں کوئی فرق نہیں اور وہ اپنے اپنے ہم شکلوں کی بوٹیاں نوچ رہے ہیں۔ صدمے اور دہشت سے اس کے منہ سے چیخ نکل جاتی ہے۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھتا ہے مگر گڑھے کے کناروں پر لرزتے سائے دیکھ کر سہم جاتا ہے اور اس سے پہلے کہ وہ فیصلہ کرے اسے اوپر دیکھتے رہنا چاہیئے یا آنکھیں بند کر لینی چاہئیں۔ کون سی دُعا پڑھنی اور کسے یاد کرنا چاہیئے تڑتڑتڑتڑ کی مسلسل آوازوں سے سارے پنچھی یکبارگی اُڑتے ہیں اور ان کی چیخ و پکار سے سارا جنگل گونجنے لگتا ہے۔

خوف ۸۵ء

دستک کی آواز سُن کر وہ ہڑبڑا کر جاگتا ہے۔ دیکھتا ہے کہ بیوی بستر پہ موجود نہیں مگر پھر باورچی خانے سے برتنوں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ وہ نیچے جانا چاہتا ہے مگر اسے ملحقہ کمرے میں سوئے ہوئے بچوں کا خیال آجاتا ہے اور اس کا دل خوف سے دھک دھک کرنے لگتا ہے جلدی سے پلٹ کر بچوں کے کمرے میں آتا اور دروازہ کھول کر دیکھتا ہے۔ بچے سو رہے ہیں بظاہر سب کچھ ٹھیک لگتا ہے پھر بھی وہ قریب جاکر جائزہ لیتا اور اطمینان کر لینا چاہتا ہے کہ کسی تکیئے یا بستر پہ خون کا کوئی چھینٹا تو نہیں۔

"نماز کا وقت ہو گیا بیٹے" ابا کی آواز دوبارہ سُنائی دیتی ہے۔

"آرہا ہوں" وہ سیڑھیاں اُترتے ہوئے جواب دیتا ہے "آپ چلیں ابا جی وضو کر کے وہ مسجد چلا جاتا ہے۔ مسجد میں بھی لوگ خوفزدہ اور سہمے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کی آنکھیں اور چہرے بتا رہے ہیں کہ وہ بالکل یا پوری طرح سو نہیں سکے ہیں مولوی صاحب دُعا میں اللہ تعالیٰ سے بہت سی چیزیں مانگتے ہیں۔ رزق حلال، جذبہ جہاد، ایمان کی طاقت، بیماروں کے لیے شفا۔ نیکیوں کی توفیق اور حوض کوثر کا جام۔ مگر جب وہ مرتے وقت کلمہ نصیب ہونے کی دُعا مانگتے ہیں۔ اُسے جھرجھری سی

آجاتی ہے کہ سوتے میں کند آلے سے ہلاک ہو جانے پر تو آدمی کلمہ بھی نہیں پڑھ سکتا۔ پھر اُسے اپنی مرحومہ ماں کی نصیحت یاد آتی ہے جو سونے سے پہلے آیۃ الکرسی اور کلمہ طیبہ پڑھنے کی تاکید کیا کرتی تھیں۔

ابّا کے ہمراہ مسجد سے واپسی پر دروازے کے پاس اخبار پڑا ملتا ہے وہ اٹھا کر دیکھتا ہے اور جلدی سے بند کر دیتا ہے اس کا جی چاہتا ہے اخبار کو کہیں چھپا دے مگر ابّا اس سے اخبار لے لیتے ہیں اور وہیں کھڑے ہو کر سُرخیاں دیکھنے لگتے ہیں۔ وہ بھاری بھاری قدموں سے اندر چلا جاتا ہے۔ دروازے میں داخل ہوتے ہوئے اسے احساس ہوتا ہے کہ اس کی چٹخنی کمزور ہے اور اسے دھکّا لگا کر آسانی سے کھولا یا توڑا جا سکتا ہے پھر اس کی نظر کھڑکیوں اور روشندانوں پر پڑتی ہے اور اسے پہلی بار پتہ چلتا ہے کہ وہ اتنے غیر محفوظ مکان میں رہتا ہے۔ افسوس مکان بناتے وقت ابّا نے ان باتوں کا خیال نہ رکھا۔ ناشتے کی میز پہ وہ ان سے اس کی شکایت کرتا ہے تو وہ کہتے ہیں۔

"سبھی لوگوں کے مکان ایسے ہی ہیں ایسے ہی ہوتے ہیں مکان قلعہ تو نہیں ہوتا اور پھر بیٹے گھسنے والے تو قلعوں میں بھی گھس جاتے ہیں بس اللہ تعالیٰ سے دُعا کرو وہ سب کو اپنی امان میں رکھے۔"

دفتر میں ہیڈ کلرک مختلف فائلوں پر اس کے دستخط کرواتے ہوئے کہتا ہے۔

"لوگ بہت زیادہ خوفزدہ ہیں سر۔ شام کو میرے بیوی بچے مجھے گھر سے نہیں نکلنے دیتے انہیں بہت ڈر لگتا ہے۔"

"ڈرنے کی کوئی بات نہیں البتہ احتیاط ضروری ہے۔"

"وہ تو ہم کر رہے ہیں مگر بجلی چلی جائے یا بے وقت کوئی دروازے پر دستک دے تو بچے پریشان ہو جاتے ہیں۔ میں نے تمام گھر والوں کو تاکید کی ہوئی ہے کہ رات کو دستک ہو تو بغیر پوچھے اور دیکھے بھالے دروازہ نہ کھولیں۔ پرسوں رات

میری بیوی کا بھانجا رات کی گاڑی سے اچانک آگیا اس نے دستک دی تو سب جاگ گئے گھر میں کہرام مچ گیا۔"

"ہاں لوگ بہت خوفزدہ ہیں ایسا نہیں ہونا چاہیئے اس سے جرائم پیشہ لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں۔"

"سر لوگ بے چارے کیا کریں وہ اپنا فضل الرحمٰن اسسٹنٹ ہے نا۔ اس نے ایک صبح دروازہ کھولا تو ایک بوری دروازے کے باہر پڑی تھی جس میں ایک ہتھوڑا رکھا تھا۔"

"پھر؟"

"پھر اس نے پولیس کو اطلاع دی اب پولیس اس کے گھر کی نگرانی کرتی ہے اس کے باوجود گھر اور محلے کے سب لوگ جاگ کر رات گزارتے ہیں اور ذرا کہیں کھٹکا ہو جائے تو ہڑبونگ مچ جاتی ہے۔"

"ٹھیک ہو جائے گا سب کچھ۔" وہ ہیڈ کلرک کو تسلی دیتا ہے "تم ٹیٹنو کو میرے پاس بھیج دو۔"

"اس کی تو چھٹی کی درخواست آئی ہے۔"

"کیوں۔"

"اپنے گاؤں چلا گیا ہے مکان مرمت کرانے۔ کل بتا رہا تھا کہ اس کے والدین اور بہنیں جس مکان میں رہتے ہیں اس کی چار دیواری کچی ہے۔"

"تو کیا پختہ کر لینے سے محفوظ ہو جائے گی؟"

"بس سر ایک تسلی تو ہو جاتی ہے دل کو۔"

"ہاں یہ بھی ضروری ہے آدمی کو اندر سے مضبوط رہنا چاہیئے۔"

"اچھا تو غلام مرتضےٰ کو بلا دو۔"

"سر وہ دیر سے آئے گا۔"

"کیوں؟"

"رات کو محلّے میں باری باری پہرا دینا پڑتا ہے۔ رات اس کی باری تھی ظاہر ہے اب سو رہا ہوگا کہتا تھا۔ دوپہر سے پہلے پہلے آجاؤں گا۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔" وہ ہیڈ کلرک کو رخصت کر کے ٹیلی فون ملاتا ہے۔

"اسلم بھائی وہ سٹریٹ لائٹس ابھی تک ٹھیک نہیں ہوئیں۔ میری نوکری کا مسئلہ ہے۔"

"میری بھی نوکری کا مسئلہ ہے۔" اسلم جواب دیتا ہے۔ "آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ نئی اور پرانی سٹریٹ لائٹس کی کتنی شکایتیں اور سفارشیں ہیں میرے پاس آپ نے اخباروں میں پڑھا ہوگا۔ کتنے لوگوں کی اپیلیں ہر روز چھپ رہی ہیں کہ ان کے علاقے میں روشنی کا بندوبست کیا جائے۔ ہم برسوں سے گلیوں کی تاریکی دور کرنے کے تخمینے بھیج رہے تھے مگر منظوری نہیں ملتی تھی اب بھی بڑی مشکلات ہیں۔"

"یار اس کا تو کچھ کرو میرے باس کا گھر ہے۔"

"میں پوری کوشش کروں گا۔ لیکن میں خود بہت پریشان ہوں۔"

"کیوں کیا ہوا؟"

"ہمارے مکان پر کسی نے نشان لگا دیا ہے۔"

"کس قسم کا نشان؟"

"پتہ نہیں بس کل صبح باہر نکلا تو دیکھا دروازے کے پاس چاک سے ایک پُراسرار نشان لگا ہوا تھا۔ اب کل سے پولیس کا پہرا ہے۔"

"یار کسی بچے کی شرارت ہوگی۔"

"شرارت تو یقیناً ہوگی مگر کسی بچے کی نہیں خاصی اونچی جگہ پہ نشان لگا ہوا تھا۔ تمہاری بھابی بہت پریشان ہے کہتی ہے فوراً مکان تبدیل کرو۔"

"بھابی کو سمجھائیں زندگی اور موت تو خدا کے ہاتھ میں ہے۔"

"ہاں بھائی بہت سمجھایا مگر وہ کہتی ہے۔ کلہاڑے اور ہتھوڑے تو نافرمانوں کے ہاتھ میں ہیں۔"

"ہاں مگر جس کی آئی ہوتی ہے وہی شکار ہوتا ہے۔"

"جناب جس کے سر پہ ہتھوڑا یا کلہاڑا لگ جاتا ہے اُسی کی آجاتی ہے۔"

"تم بہک رہے ہو کفر کے کلمے مت بولو اللہ رحم کرے گا۔"

"ہاں یار بس دُعا کرو۔ اچھا خدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔"

دفتر سے واپسی پر ویگن میں سوار ہوتا ہے۔ چار چار کی سیٹوں پر چھ چھ مسافر ایک دوسرے میں دھنسے بیٹھے ہیں۔

"مجھے تو یہ کوئی بہت بڑا چکر معلوم ہوتا ہے۔" ایک کہتا ہے۔

"بھائی تمہارے علاقے میں تو سُنا ہے پولیس رات کو گشت کرتی ہے۔" دوسرا کہتا ہے۔

"ہاں اسی لیے تو ہم زیادہ خطرے میں ہیں۔" پہلا قہقہہ لگاتا ہے۔

"آہستہ ہنسیئے صاحب۔"

"کیوں پابندی لگ گئی ہے؟"

"نہیں آپ کے ہنسنے سے میری پسلی میں درد ہوتا ہے۔"

"آخر پولیس اس قدر بے بس کیوں نظر آتی ہے؟" پیچھے سے آواز آتی ہے۔

"آپ کو پولیس کے نظر آنے پر اعتراض ہے یا اس کی بے بسی پر؟"

"ہو سکتا ہے انہیں سب کچھ معلوم ہو کسی مجبوری یا مصلحت کی بناء پر فی الحال ظاہر نہ کرنا چاہتے ہوں۔"

"جی ہاں ممکن ہے اس سے اور زیادہ دہشت پھیلنے کا ڈر ہو۔"

"ویسے خاصے تربیت یافتہ لوگ معلوم ہوتے ہیں۔ بڑی مہارت سے واردات کرتے ہیں کوئی نشانی نہیں چھوڑتے۔"

"جی ہاں ——— پتہ نہیں انجام کیا ہو گا۔"

"جرائم بہت بڑھ گئے ہیں صاحب۔"

"جی ہاں یہی محسوس ہوتا ہے جیسے ہم کسی بڑی واردات کے سائے میں سانس لے رہے ہیں۔"

"اللہ اپنا رحم کرے۔"

"کیوں بھائی صاحب آپ کے محلے میں بھی ٹھیکری پہرہ ہے؟"

"جی ہاں ہے تو سہی۔ مگر روشنی کا کوئی بندوبست نہیں بڑا اندھیرا ہے۔"

ویگن سٹاپ سے گھر کی طرف جاتے ہوئے اس کی نظر ہارڈ ویئر کی دکان پر پڑتی ہے۔ وہ چٹخنیاں خریدنے کے لیے رک جاتا ہے۔ اسی لمحے دکان میں کھڑا ایک مضبوط جسم کا میلا کچیلا آدمی ہتھوڑا اٹھا کر اس کی قیمت دریافت کرتا ہے۔ اس کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہتھوڑا پسند کرنے اور وزن کرا کے پیسے ادا کرنے میں چند منٹ لگتے ہیں مگر اتنی دیر میں دکان کے دروازے پر لوگوں کی بھیڑ لگ جاتی ہے۔ بھیڑ کو دیکھ کر راستہ چلتے مزید لوگ جمع ہو جاتے ہیں پھر پولیس کے ایک آدمی کو بلا لیا جاتا ہے۔

"کون ہو تم؟" سپاہی پوچھتا ہے "اور ہتھوڑا کیوں خرید رہے ہو؟"

ہتھوڑا خریدنے والا پریشان ہو کر ہجوم کی طرف دیکھتا ہے پھر کہتا ہے۔

"میں مستری ہوں کنکریٹ توڑنے کے لیے مجھے اس کی ضرورت ہے۔"

"کنکریٹ توڑنے کے لیے یا ——؟ سپاہی کہتا ہے "بھئی میرے ساتھ تھانے چلنا ہو گا۔"

"مگر کیوں؟" مستری کہتا ہے "کیا ہتھوڑا خریدنا جرم ہے؟"

"اس کا نہیں وہیں چل کر پتہ چلے گا۔"

"جناب میں نیا نیا آیا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اب ہتھوڑا خریدنے کے لیے پرمٹ لائسنس حاصل کرنا پڑتا ہے۔"

"زیادہ بک بک نہ کرو۔ ابھی سب پتہ چل جائے گا چلو۔"

سپاہی اُسے ساتھ لے کر جاتا ہے لوگوں کا ایک ہجوم ان کے ہمراہ چلتا ہے۔

وہ چٹخنیاں خرید کر گھر کا رُخ کرتا ہے۔ کھانا کھا کر آرام کرنا چاہتا ہے مگر اس کا پڑوسی دوست محمد آجاتا ہے۔

"میں نے اسلحہ لائسنس کے لیے درخواست دی تھی۔ وہ کہتے ہیں اپنے پڑوسیوں سے تصدیق کرا کر لاؤ۔"

"کس بات کی تصدیق؟"

"یہ کہ ان سے میرے تعلقات اچھے ہیں اور وہ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔"

وہ دوست محمد کے کاغذات پر دستخط کر دیتا ہے۔ دوست محمد شکریہ ادا کر کے چلا جاتا ہے۔ تو اسے ایک بُرا سا خیال آتا ہے کہ نہ جانے کب دوست محمد سے اس کے تعلقات کشیدہ ہو جائیں۔"

شام کو صدیقی آجاتا ہے۔ چائے کا دور چلتا ہے۔ خوب گپ شپ ہوتی ہے پھر صدیقی کہتا ہے

"یار راستے میں ایک شخص نے جو کسی جسمانی تکلیف میں مبتلا معلوم ہوتا تھا مجھ سے لفٹ مانگی مگر میں نے موجودہ حالات کے پیش نظر اجنبیوں کو لفٹ دینا چھوڑ دیا ہے پتہ نہیں کون کیسا ہو مگر اب مجھے رہ رہ کر افسوس ہو رہا ہے۔"

"افسوس سے احتیاط بہتر ہے۔"

"پرسوں میں جی پی او سے نکلا۔" صدیقی کہتا ہے "تو ایک خوبصورت اور جوان لڑکی

نے مجھے رُکنے کا اشارہ کیا۔ یار بڑی حسرت رہتی تھی کسی ایسے بھولے بھٹکے مسافر کو منزل پر پہنچانے کی مگر دل پر جبر کرنا پڑا۔"

"چھوڑو یار ——— اب عورتوں سے بھی ڈرنے لگے ہو۔"

"عورتوں سے کیا لوگ تو اپنے سائے سے بھی ڈرنے لگے ہیں اور پھر وہ واقعہ تمہیں یاد ہے ہائی وے والا؟"

"کون سا؟"

"وہ جو ایک عورت اور اس کے ساتھی پکڑے گئے تھے وہ لفٹ لے کر سوار ہو جاتی تھی پھر اس کے ساتھی کار میں تعاقب کر کے لفٹ دینے والے کو بلیک میل کرتے اور لوٹ لیتے تھے۔" اچانک صدیقی کی نظر گھڑی پر پڑتی ہے اور وہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔

"یار دیر ہو گئی مجھے ایک اور جگہ ضروری پہنچنا ہے۔ پھر ملاقات ہو گی۔ خدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔"

رات کو سونے سے پہلے وہ تمام کھڑکیوں اور دروازوں کی نئی پرانی چٹخنیاں اور کنڈیاں خود بند کرتا ہے۔ گھر میں اچھی طرح گھوم پھر کر اطمینان کرتا ہے کہ تمام روشندان بند ہیں۔ اس کے باوجود اس کی تشفی نہیں ہوتی اسے کھڑکیاں، دروازے اور روشندان نہایت کمزور اور بوسیدہ دکھائی دیتے ہیں۔ پکی دیواریں گارے کی بنی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ اسے ایسا لگتا ہے جیسے وہ سنگ و خشت کے گھر میں نہیں گتے سے بنائے گئے مکان میں رہ رہا ہو۔ بستر پہ دراز ہوتے وقت اچانک اس کی نظر الماری کے اوپر رکھے ہیلمٹ پر پڑتی ہے جو اس نے ان دنوں خریدا تھا۔ جب اس کے پاس سکوٹر تھی، اس کا جی چاہتا ہے وہ ہیلمٹ پہن کر سوئے مگر پھر اسے اپنی اس بزدلانہ اور خود غرضانہ سوچ پر ہنسی آجاتی ہے اگلی صبح وہ دستک سے پہلے

خود بخود اٹھ بیٹھتا ہے۔

دیکھتا ہے کہ کمرے کی ساری چیزیں اپنی اپنی جگہ پر موجود ہیں مگر اس کی بیوی جو ہمیشہ اس سے پہلے جاگتی ہے ابھی تک سو رہی ہے اس کے سونے کا انداز عجیب سا ہے بال بکھرے ہوئے ہیں وہ بے سُدھ سی پڑی ہے۔ وہ سو رہی ہے یا؟

خوف کی ایک لہر اس کے رگ و پے میں دوڑ جاتی ہے۔ یہ یقین کرنے کے لیے کہ اس کی کھوپڑی سلامت ہے وہ آگے بڑھ کر اس کے بالوں کو چھُوتا ہے وہ چیخ مار کر اُٹھ بیٹھتی ہے۔ وہ اس کے مُنہ پر ہاتھ رکھ کر مشکل سے اُسے چُپ کراتا ہے۔ حواس درست ہونے پر وہ کہتی ہے۔

"کیا بات ہے آپ مجھ پر اس طرح کیوں جُھکے ہوئے تھے؟"

"کچھ نہیں۔ ایسے ہی"

"ایسے ہی کیوں" وہ اسے شک بھری نظروں سے دیکھتی ہے۔

"بھئی میں ——— وہ ——— تمہاری زلفیں" وہ بات ٹالنا چاہتا ہے۔

"آہستہ بولئے بچے جاگ جائیں گے" وہ لجا کر کہتی ہے "میں سمجھی تھی آپ میرا گلا"

وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھتا ہے اور سر پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے"

زوال سے پہلے

زمانے کی قسم انسان دراصل بڑے خسارے میں ہے
سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کئے
اور آپس میں حق کی پیروی اور صبر کی تلقین کرتے رہے
(والعصر)

کیا دیکھتا ہوں کہ مسمار شدہ عمارات کا ملبہ دور دور تک بکھرا پڑا ہے۔ فضا دھوئیں اور بارود کی بو اور گرد و غبار سے اٹی ہوئی ہے۔ ہریالی اور درخت جھلسے ہوتے ہیں اور چند عورتیں اور بچے جن کے لباس گرد آلود ہیں۔ ملبے سے پرانی اور استعمال شدہ اینٹیں نکال کر اور لکڑیوں کے ادھ جلے تختے جوڑ کر ایک چبوترا سا تیار کر رہے ہیں۔ پھر ایک بچہ کہیں سے لوہے کی دو ٹانگوں والی کرسی اٹھا لاتا۔ اور عین درمیان میں رکھ دیتا ہے۔ ایک دوسرا ٹوٹے ہوئے پایوں کے نیچے اینٹیں جوڑ دیتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے اسٹیج تیار کیا جا رہا ہو۔ شاید کوئی المیہ یا طربیہ کھیل شروع ہونے والا ہے۔

اسٹیج مکمل ہو جاتا ہے۔ تو عورتیں اور بچے کچھ فاصلے پر اس طرف کو منہ کر کے جدھر سے سورج نکلتا ہے۔ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور کسی کا انتظار کرنے لگتے ہیں۔ تھوڑی ہی دیر میں بے آواز قدموں سے چلتا سفاک چہرے والا ایک بڑی عمر کا شخص نمودار ہوتا ہے۔ وہ بے نیازی سے

گزر جانا چاہتا ہے۔ مگر نڈھال نظر آنے والی عورتیں اور ویران چہروں والے بچے اس کا راستہ روک لیتے ہیں۔ اور انصاف انصاف پکارتے ہیں۔ سفاک چہرے والا شخص چلتے چلتے رک کر انہیں دیکھتا ہے۔ لمحہ بھر کے لئے تامل کرتا ہے۔ پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتا سٹیج کی طرف آتا اور کرسی پر بیٹھ جاتا ہے نہایت شاہانہ انداز میں ہاتھوں سے تالی بجاتا ہے۔ تالی کی آواز دور تک گونجتی ہے۔ دوسرے ہی لمحے ہر طرف سے آدمیوں کے دوڑ کر آنے کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ اور ذرا سی دیر میں مختلف عمروں کے بہت سے آدمی راکھ میں لتھڑے ہوئے چوں چوں کرتے چوزوں کی طرح آتے اور گردنیں جھکا کر اسٹیج کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایک زرد رو بچہ اشارہ پا کر آگے بڑھتا ہے اور لوگوں اور سٹیج کے درمیان کھڑے ہو کر بلند آواز میں کہتا ہے۔

"کارروائی شروع ہوتی ہے"

کھسر پھسر کرتے لوگ خاموش ہو جاتے ہیں۔ ہر طرف گہرا سناٹا چھا جاتا ہے۔ بچہ پھر کہتا ہے۔

"عدالت جاننا چاہتی ہے کون ذمہ دار ہے"

سب لوگ نظریں نیچی کئے چپ چاپ کھڑے رہتے ہیں کوئی جواب نہیں دیتا

"بولو —— جواب دو" منصف کی رعب دار آواز گونجتی ہے۔

سکوت اور گہرا ہو جاتا ہے گردنیں اور زبانیں جھک جاتی ہیں۔ سبھی سکڑ اور سمٹ کر خود کو ایک دوسرے کے پیچھے چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ عدالت کی معاونت کرنے والا بچہ اگلی قطار کے گرد و غبار میں اٹی پگڑیوں، کلاہوں، ٹوپیوں، اچکنوں، سوٹوں، وردیوں اور مختلف لباسوں والے ایک ایک آدمی کے پاس جاتا۔ اور اس سے گردن اٹھا کر اپنا چہرہ عدالت کو دکھانے کے لئے کہتا ہے۔ ہر شخص اپنی باری آنے پر چہرہ اوپر اٹھاتا ہے۔ پھر نظریں اور گردن جھکا لیتا ہے۔ پہلی کے بعد دوسری۔ پھر تیسری۔ چوتھی سبھی قطاروں کے لوگ اپنی اپنی جگہ مجرموں کی طرح کھڑے رہتے ہیں۔ منہ سے کوئی کچھ نہیں بولتا۔

"عدالت جاننا چاہتی ہے، کون قصوروار ہے؟" زرد رو بچہ ایک ایک کے پاس جاکر پوچھتا ہے۔ مگر کوئی جواب نہیں دیتا۔ مگر پھر سب سے آخر میں کھڑا زخمی چہرے والا شخص بول اٹھتا ہے اور اپنے قریب کھڑے شخص کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہے۔

"یہ ذمہ دار ہے۔"

ساتھ والا شخص ہڑبڑا جاتا ہے۔ مگر پھر سنبھل کر اپنے آگے کھڑے تیسرے شخص کی طرف اشارہ ہے اور کہتا ہے

"یہ ذمہ دار ہے"

پھر تیسرا چوتھے کی طرف اور چوتھا پانچویں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ پھر سبھی ایک دوسرے کو قصوروار ٹھہرانے لگتے ہیں اور کچھ پتہ نہیں چلتا کون کس کو قصوروار ٹھہرا رہا ہے

"خاموش خاموش" اسٹیج سے گرجدار آواز سنائی دیتی ہے۔ سب سہم جاتے ہیں۔ اور گردنیں جھکا کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

"صفائی کا موقع دیا جاتا ہے" آواز دوبارہ سنائی دیتی ہے۔

لوگوں میں پھر سے کھسر پھسر شروع ہو جاتی ہے۔ پھر درمیان کی کسی قطار سے کٹے ہوئے بازو والا ایک شخص آگے آتا ہے۔ اس نے پھٹی ہوئی آستینوں والا وکیلوں کا کوٹ پہنا ہوا ہے، وہ اپنے اکلوتے ہاتھ سے چہرے اور کپڑوں کی گرد جھاڑتا جھک کر تعظیم کرتا اور کہتا ہے

"اجازت ہے؟"

"اجازت ہے!"

"حضور وہ شخص جو اس کا ذمہ دار تھا، اب ہم میں نہیں رہا"

"کیا ہوا اسے"

"جناب والا ـــ اس کو اپنے کئے کی سزا مل چکی ہے۔"

"کیا وہ اکیلا ہی ذمہ دار تھا؟"

"نہیں حضور ـــــ اس کے بہت سے قریبی ساتھی اور معاون تھے۔"

"ان سب کو پیش کیا جائے۔"

"حضور ان کو بھی سزا مل چکی ہے"

اسی لمحے لوگوں کے عقب سے ہانپتی کانپتی کاغذوں کا پلندہ اٹھائے درمیانی عمر کی ایک عورت آتی ہے۔ اور لوگوں کے درمیان سے گذر کر عدالت کے سامنے جا کھڑی ہوتی ہے۔ اور آداب بجالاتی ہے۔

"تم پھر دیر سے آئی ہو؟" عدالت اسے تنبیہہ کرتی ہے۔

"میں معافی چاہتی ہوں جناب والا۔ مجھے روزنامچہ مکمل کرنے میں دیر ہو گئی ـــ دراصل میرے کام کی نوعیت ہی کچھ ایسی ہے جضور کہ مجھے دیر ہو جاتی ہے"

"عدالت کو بتایا گیا ہے کہ اصل مجرم اور اس کے ساتھی اپنے کئے کی سزا پا چکے ہیں اگر تمہیں کچھ نہ کہنا ہو تو فیصلہ سنایا جائے۔

"مجھے بہت کچھ کہنا ہے عالیجاہ" وہ کہتی ہے۔ "میں موقع کی عینی شاہد ہوں"

"اجازت ہے"

"یہ درست ہے جناب والا" وہ ٹھہر ٹھہر کر باوقار انداز میں کہتی ہے۔ "کہ اصل مجرم اور اس کے معاون سزا پا چکے ہیں۔ لیکن یہ سب لوگ جو آپ کے سامنے حاضر ہیں۔ اس سنگین جرم میں شریک رہے ہیں۔"

ہجوم میں بے چینی پھیل جاتی ہے۔ آوازیں سنائی دیتی ہیں

"نہیں نہیں ـــ ہم مجرم نہیں ہیں۔"

"ہم بے قصور ہیں"

"ہم بے گناہ ہیں"

"خاموش خاموش"

"حضور والا حقیقت یہ ہے" وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہتی ہے۔ "جو کچھ ہوا ان سب کے سامنے ہوا۔ اگر یہ چاہتے اور کوشش کرتے۔ تو اس کا تدارک کر سکتے تھے میرے پاس اس کے بہت سے شواہد ہیں کہ یہ سب بھی اس کے ذمہ دار ہیں۔ اس لئے ان کو بھی کڑی سزا ملنی چاہیئے"

وکیل صفائی لمحہ بھر کے لئے سر کھجاتا ہے۔ پھر عدالت سے مخاطب ہوتا ہے۔

"یہ درست ہے جناب عالی کہ جرم کو ہوتے ہوئے دیکھنا اور اس کا تدارک نہ کرنا غفلت ہے لیکن"

"مجرمانہ غفلت" وہ ٹوکتی ہے۔

"لیکن نہتا آدمی" وکیل صفائی اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے ——

"خواہ وہ کتنا ہی بہادر، دانشمند اور دور اندیش کیوں نہ ہو مسلح آدمی کو جرم کے ارتکاب سے روکنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ ایسی بے شمار مثالیں ہیں کہ ایک یا چند مسلح اشخاص نے بہت سے نہتے آدمیوں کو زیر کیا۔ انہیں اپنا ہم خیال اور غلام بنایا۔ ان سے سب کچھ چھین لیا۔ ان کا مال اسباب۔ زمینیں، عورتیں اور بعض اوقات عقیدے اور ان پر طویل عرصے تک حکمرانی کرتے رہے۔ یہاں تک کہ مفتوح بھول گئے کہ وہ کون اور کیا تھے۔ کبھی وہ آزاد اور فارغ البال بھی تھے۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ میرے مؤکلین جن میں میں خود بھی شامل ہوں بے قصور ہیں۔ وہ اگر چاہتے بھی تو حماقتوں اور غلطیوں کے ارتکاب کو نہیں روک سکتے تھے۔ البتہ وہ غفلت اور کوتاہی کے ضرور مرتکب ہوتے ہیں۔ اور اس کی سزا بھی پا رہے ہیں۔ لیکن وہ مجرم نہیں ہیں"

"حضور —— میں موقع کی گواہ ہوں۔ میں نے ان میں سے ہر ایک کی کارگزاری کی پوری تفصیل قلمبند کر رکھی ہے۔ یہ محض تماشائی نہ تھے۔ بلکہ انہوں نے اس ٹریجڈی میں خود بھی چھوٹے موٹے مختلف رول ادا کئے ہیں۔ یہ محض غفلت کے مرتکب نہیں ہوئے بلکہ

ان میں سے ہر ایک نے اپنے اعمال وافعال سے تباہی کے اسباب مہیا کئے۔ اگر یہ باہمی نفاق و انتشار اور مصلحتوں سے کام نہ لیتے۔ تو یہ المیہ کبھی پیش نہ آتا۔ حضور والا! کوئی واقعہ اچانک ظہور پذیر نہیں ہوتا اس کے اسباب وعلل پہلے سے وجود میں آچکے ہوتے ہیں۔ انہوں نے سچ بولنا اور سننا ترک کر دیا تھا۔ سچائی ان کے دروازوں پر بار بار دستک دیتی مگر یہ ہر بار اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیتے۔ ہوا ایک عرصہ سے ان کے درختوں سے سر ٹکرا رہی تھی۔ مگر انہوں نے اس کی سسکیوں پر کان نہ دھرا۔ بادلوں نے بہت عرصہ پہلے ان کے کھیتوں پر برسنا چھوڑ دیا تھا۔ مگر انہوں نے دعا تک کے لئے ہاتھ نہ اٹھائے موسموں میں ان کی آنکھوں کے سامنے تغیر ہوا۔ سورج نے دیر سے نکلنا اور جلدی ڈوبنا شروع کر دیا۔ مگر یہ بے خبر وقتی لذتوں میں کھوتے رہے۔ ان کے نعمت خانوں اور اناج سے بھرے گوداموں کے باہر فاقہ زدہ لوگ اور ان کے ڈرگ اسٹورز اور دواخانوں کے باہر مریض دوا نہ ملنے پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاتے تھے۔ مگر ان کے دل نہ پسیجتے تھے۔ میں ان کو برابر بتاتی رہی کہ ان سے پہلے ایسا کرنے والوں کا کیا انجام ہوتا رہا ہے۔ مگر میری کسی بات پر انہوں نے دھیان نہ دیا۔ میری درخواست ہے کہ ان سب سے نہ صرف باز پرس کی جائے بلکہ انہیں ان کی مجرمانہ غفلتوں اور عاقبت نا اندیشیوں کی سخت سزا دی جائے۔"

"آپ کو مزید کچھ کہنا ہے؟" عدالت وکیل صفائی سے پوچھتی ہے۔

"جی جناب عالی" وکیل صفائی کہتا ہے "میرے موکلین میں ہر شعبے اور پیشے سے تعلق رکھنے والے لوگ شامل ہیں۔ ان میں لیڈر ہیں جو برابر لوگوں میں سیاسی شعور بیدار کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ اس کے لئے انہوں نے قید وبند کی سختیاں تک جھیلیں اور صعوبتیں برداشت کیں۔ ان میں علمائے دین ہیں جو گناہوں اور برائیوں سے بچنے کی تلقین کرتے رہے۔ اور لوگوں کو برابر نیکی اور راست بازی کی طرف بلاتے رہے۔ ان میں دانشور اور ادیب ہیں جو اپنے خونِ جگر سے کام لیکر اعلیٰ اقدار کے فروغ و تحفظ کے لئے

کوشاں رہے۔ ان میں باضمیر صحافی ہیں جو لوگوں کو اچھے اور بُرے حالات سے باخبر اور نتائج سے آگاہ کرتے رہے۔"

"مجھے تسلیم ہے جناب والا" وہ کہتی ہے۔ "سب لوگ ایک جیسے نہیں تھے۔ ان میں بعض محنتی مخلص، نڈر اور راست باز بھی تھے۔ لیکن ایسے لوگوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی۔ افسوس ایسے لوگ اپنوں ہی کے ہاتھوں مارے گئے، بدقسمتی سے خودغرض، ریاکار اور نااہل لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہوگئی تھی۔ اجتماعی معاملات اور مسائل کی بجائے ہر کسی کو اپنے ذاتی مفادات اور اپنے اعزہ واقربا کا زیادہ خیال رہتا تھا۔ لوگ حالات کے مطابق سانچوں میں ڈھل جاتے اور اپنے موقف میں لچک اور تبدیلی پیدا کر لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ جھکنا نہیں ٹوٹنا جانتے تھے۔ وہ ٹوٹ گئے اور جھکنے والے اب تک بے غیرتی سے جیتے چلے جاتے ہیں حضور والا ان کے عالموں کا یہ حال تھا کہ وہ علم کے نام سے بدکتے بلکہ نئی سوچ، نظریات اور علمی باتوں کا مذاق اڑاتے تھے۔ انہوں نے سوچنا۔ سوال کرنا۔ شک اور انکار کرنا چھوڑ دیا تھا۔ جو علم کی اوّلین شرط ہے۔ نتیجہ اس کا یہ نکلا کہ ان کے ذہن کند اور زنگ آلود ہوتے چلے گئے۔ ان کے تلاش وتحقیق کے جذبے ماند پڑ گئے اور ایجاد وتخلیق کے سوتے خشک ہو گئے۔ ان کے مذہبی راہنما طبقوں میں بٹے ہوئے لوگوں کو فرقہ وارانہ منافرت پھیلا کر مزید گروہوں میں تقسیم کرتے رہتے تھے۔ ان کے دانشور اور شاعر وادیب اہلِ اقتدار کے مفادات کا تحفظ کرتے ان کے قصیدے لکھتے اور ان کی خوبیوں کے جوان میں موجود نہ ہوتیں گن گاتے اور انعام واکرام پاتے تھے۔ انہوں نے عام لوگوں کی زبان کے دائرے میں رہتے ہوئے بھی کوڈز کے ذریعے اپنی ایک علیحدہ اور خاص زبان ایجاد کر لی تھی۔ جسے دوسرے لوگ نہیں سمجھ سکتے تھے۔ خیالی حسیناؤں سے ہم کلامی اور مباشرت ان کی شاعری کا اہم ترین موضوع تھا۔ فن اور ادب محض ذاتی شہرت اور دولت کمانے کا ذریعہ بن کر رہ گیا تھا جہاں تک صحافت کا تعلق ہے۔ یہ اس دور کی سب سے

بڑی تجارت تھی۔ سچائی کو چھپایا جاتا تھا۔ اور لوگوں کو جھوٹے من گھڑت اور سنسنی خیز واقعات کی طرف راغب کیا جاتا تھا۔ کلمۂ حق کہنے کے لئے جابر سلاطین کے اقتدار سے ہٹنے کا انتظار کیا جاتا تھا۔ اس ضمن میں میرے ریکارڈ میں اتنے بہت سے واقعات ہیں۔ کہ ان کے بیان کرنے کے لئے کئی دفتر درکار ہوں گے۔ مگر میں فاضل عدالت کا زیادہ وقت نہیں لینا چاہتی صرف اتنا عرض کرنا چاہتی ہوں کہ ان کے سبھی اداروں کی اخلاقی حالت زوال آمادہ تھی۔ جس کے ہاتھ میں طاقت اور روپیہ آجاتا تھا۔ وہ معزز اور طاقتور بن جاتا تھا۔ یہاں تک کہ اگر یہ گلی میں پہرہ دینے کے لئے چوکیدار کے ہاتھ میں لاٹھی یا بندوق تھماتے تھے۔ تو وہ غنڈہ ٹیکس وصول کرتا یا لوٹ مار کرنے لگتا تھا۔ اور ان کی پولیس۔ سچی بات تو یہ ہے جناب والا کہ خود مجھے اس سے ڈر لگتا رہا ہے۔ انہوں نے کئی مرتبہ میرے کاغذات بھی گم کر دیئے۔ یا چھین کر ان میں ردوبدل کر دیا۔

"حضور میں احتجاج کرتا ہوں" وکیل صفائی جوش سے کہتا ہے ——————

"جناب والا معزز گواہ ایسی ذاتی اور انفرادی مثالوں سے میرے تمام مؤکلین کو قصور وار نہیں ٹھہرا سکتیں۔ ان میں زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے معزز اور مخلص لوگ بھی شامل ہیں جو محنت سے کام کرتے رہے اور اپنی ذمہ داریاں دیانتداری سے نبھاتے رہے۔ اگر معزز گواہ کے کاغذات گم ہوتے ہیں یا ان میں ردوبدل ہوا ہے تو مجھے اس کا افسوس ہے لیکن"

"جناب والا" وہ وکیل صفائی کی بات کاٹ کر کہتی ہے۔ "یہ میرے ذاتی کاغذات نہیں تھے۔ اور پھر وکیل صفائی کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ میں اپنے اصل مسودے ایسی جگہوں پر محفوظ کر دیتی ہوں۔ جہاں کسی اچکے کا ہاتھ نہ پہنچ سکے۔ میری تحریریں اتنی آسانی سے مٹائی یا تبدیل نہیں کی جا سکتیں۔ وہ پتھر پر لکیر ہوتی ہیں صدیوں بعد بھی آپ کو چٹانوں پر کندہ اور غاروں میں محفوظ ملیں گی۔"

"معزز گواہ خود ستائی پر اتر آئی ہیں جناب والا۔ ان باتوں کا مقدمے سے کوئی تعلق نہیں ہے"

"بہت زیادہ تعلق ہے حضور"

"عدالت تمہاری خوبیوں سے واقف ہے اور اس کی معترف ہے۔ آگے چلو اور اختصار سے کام لو"

"میں معافی چاہتی ہوں عالیجاہ۔ میں کوشش کروں گی۔ فاضل عدالت کا زیادہ وقت نہ لوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جناب والا کہ یہ سب لوگ اپنی اپنی جگہ لوٹ کھسوٹ میں لگے ہوئے تھے۔ یہ چھوٹے چھوٹے روزمرہ معاملات میں ایک دوسرے کے ساتھ دھوکہ کرتے اور نفرتوں کے بیج بوتے تھے۔ ملاوٹ، منافقت اور ناانصافی ان کے معمولات زندگی کا جزو بن چکی تھیں۔ ایک دوسرے کا اعتماد کھو کر یہ اپنی اپنی جگہ زوال اور تباہی کو آوازیں دیتے تھے۔ ان سے پوچھا جائے کہ ان کے وہ عالیشان محل اور بنگلے اب کہاں ہیں جن کے حصول کے لئے انہوں نے ایک دوسرے کی حق تلفیاں کیں ان کی وہ دولت کیا ہوئی جو انہوں نے ایک دوسرے سے چھین جھپٹ کر یا دھوکہ دہی کے ذریعے حاصل کی تھی۔ اور ان کی عشرت گاہیں اب کہاں ہیں۔ جہاں کسی مظلوم کی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ افسوس انہوں نے میری کسی بات پر عمل نہ کیا اور برباد ہوتے۔ میری درخواست ہے کہ ان کو عبرتناک سزا ملنی چاہیئے"

لوگوں میں پھر کھسر پھسر شروع ہو جاتی ہے۔ وکیل صفائی سر کھجاتا ہے، عدالت کی طرف تشویش بھری نظروں سے دیکھتا ہے اور کہتا ہے۔

"میرے موکلین اپنی کوتاہیوں اور غفلتوں پر شرمندہ ہیں اور فاضل عدالت سے رحم کی اپیل کرتے ہیں۔"

"انصاف انصاف" اسٹیج کے اطراف سے عورتوں اور بچوں کی ملی جلی آوازیں سنائی دیتی ہیں"

"عدالت عینی شاہد کے بیانات سن کر اس نتیجے پر پہنچی ہے۔ کہ تمام بالغ لوگ کسی نہ کسی طرح جرم میں شریک رہے ہیں۔ اور مجرمانہ غفلت کے مرتکب ہوتے ہیں عدالت انہیں اسی حال میں رہنے کی سزا سناتی ہے۔"

"رحم ـــــ رحم ـــــ حضور ـــــ رحم"

"عدالت برخاست کی جاتی ہے۔"

سفاک چہرے والا بوڑھا منصف اٹھ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ایک طرف کو چل دیتا ہے۔ وہ ایک دوسرے کی طرف پریشان نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اسی لمحے بگل کی آواز سنائی دیتی ہے۔ سرخ وردیوں میں ملبوس سپاہی ہاتھ میں ہنٹر لئے چاروں طرف سے انہیں گھیر لیتے ہیں پھر ان میں سے ایک آگے بڑھ کر کہتا ہے۔

"یہاں کیا کر رہے ہو ـــــ اٹھو کے بیٹھو ـــــ اپنے اپنے کام پر چلو"

سب لوگ کدالیں اور بیلچے لے کر ملبہ ہٹانے میں لگ جاتے ہیں۔

میری آنکھ کھل جاتی ہے۔

دیکھا ہوا منظر

ہوا چلتی تھی۔ سورج چمکتا تھا۔ سمندر زمین کے تین چوتھائی حصے میں بڑا ہانپتا رہتا تھا۔ گھاس اگتی تھی۔ بیلیں پھیلتی تھیں۔ پیڑ بڑھتے تھے۔ بور آتا تھا۔ پھول کھلتے تھے۔ چڑیاں چہچہاتی تھیں۔ کوئل کوکتی تھی۔ بادل برستے تھے۔ چاندنی چٹکتی تھی۔ ڈھول بجتے تھے۔ اور میں نیکوڑے میں لیٹا نئے نئے الفاظ سیکھنے کی مشق کرتا تھا۔

"ایک روز انہوں نے کہا "مان"

اور میں نے مان لیا۔

لیکن اس میں میری مرضی شامل نہیں تھی۔ کیوں کہ اس وقت میری اپنی کوئی مرضی یا پسند نہیں تھی۔ مجھے معلوم ہی نہ تھا۔ کہ کیا مان رہا ہوں۔ اور کس بات کا اقرار کر رہا ہوں اور اس ماننے اور اقرار کر لینے کے علاوہ بھی کوئی صورت ہوتی ہے۔ مثلاً۔ انکار

پھر انہوں نے کہا "پڑھ اور جان"

میں اگرچہ اس قابل نہیں تھا۔ کہ جان سکتا وہ مجھے کیوں اور کیا پڑھانا چاہتے تھے اور مجھے کیا پڑھنا اور کیا نہیں پڑھنا چاہیئے تھا۔ پھر بھی میں نے اپنی فطری نا اہل پسندی کی وجہ سے چاہا کہ نہ پڑھوں۔ مگر انہوں نے مجھے بہلایا، پھسلایا۔ ڈرایا۔ دھمکایا اور بعض اوقات مارا پیٹا ـــــ اور مجھے پڑھنا پڑا۔ وہی کچھ جو وہ چاہتے تھے۔ جو کچھ وہ جانتے تھے۔

اور جو کچھ انہوں نے خود پڑھا تھا۔ اور میں وہ سب کچھ نہ پڑھ سکا — جو انہوں نے نہیں پڑھا تھا۔ اور جس کو وہ نہیں جانتے اور مانتے تھے۔ اور اس کی ضرورت سمجھتے تھے۔ لیکن ان باتوں کا علم مجھے بعد میں ہوا۔

پھر انہوں نے کہا کہ غور کر۔

اور میں نے سوچنا شروع کیا اور میرا خیال ہے کہ یہیں سے خرابی پیدا ہوئی۔ میں سوچتا رہتا۔ جو کچھ مجھے بتایا اور پڑھایا جاتا۔ اس پر غور کرتا۔ میں میخ نکالتا۔ ایسا کیوں ہے۔؟ ویسا کیوں نہیں ہے؟۔ بعض اوقات مجھے شبہ ہونے لگتا جیسے مجھ سے کچھ چھپایا جا رہا ہو۔ پتہ نہیں مجھ سے کچھ چھپایا جاتا تھا۔ یا ان کی معلومات ناکافی تھیں۔ وہ میرے سوالوں کے تسلی بخش جواب نہ دیتے۔ رفتہ رفتہ مجھے انکی باتوں اور ان کی کتابوں میں جو وہ مجھے پڑھاتے تھے غلطیاں نظر آنے لگیں جن کو وہ نہیں جانتے تھے۔ اور نہ جاننا چاہتے تھے۔ ان کتابوں میں بعض سوالوں کے جواب غیر تسلی بخش تھے۔ بعض سوالوں کے جواب سرے سے درج ہی نہیں تھے۔ ایسا کیوں تھا؟ میں جس قدر سوچتا ذہن میں دھند پھیلنے لگتی۔ ذہن میں جس قدر دھند پھیلتی اسی قدر حبس بڑھتا۔ اور سوالوں کی نئی نئی کھمبیاں اگنے لگتیں۔ تب مجھے یہ پتہ بھی چلا کہ ان کتابوں میں بعض سوالات بھی موجود نہیں تھے۔ میں ان سے پوچھتا تو وہ ٹال دیتے اصرار کرتا تو برا مناتے۔ غیر متعلق سوالوں اور نصاب سے خارج باتوں پر سوچنے اور گفتگو کرنے سے منع کرتے۔ سوچنا میرے بس میں تھا۔ میں سوچتا نہ سوچنا میرے اختیار میں نہ تھا۔ مجھے تسلیم ہے کہ میں ان کے منع کرنے کے باوجود نصاب سے خارج باتوں اور غیر متعلقہ سوالوں کے بارے میں اکثر سوچتا رہتا تھا۔ پتہ نہیں یہ عادت مجھے کیسے پڑ گئی تھی

اپنے سوالوں کے تسلی بخش جوابات نہ پاکر میرے دل میں مزید سوالات کلبلانے لگے — شکوک سر ابھارنے لگے اور شبہات پالنے سے نکل کر پاؤں پاؤں چلنے لگے۔ بعض اوقات مجھے لگتا میں بھتنوں کے طلسماتی لشکر میں گھر گیا ہوں۔ اور میرے اپنے تیر پلٹ کر مجھے ہی گھائل

کر رہے ہیں اور کوئی میری مدد کرنے والا نہیں ہے۔ میں نے ان سے مدد چاہی تو انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ اور کہا کہ میں نے ان کے احکامات کی خلاف ورزی کی ہے۔ اور سوچ کی معین حدوں سے تجاوز کیا ہے۔ اس لئے وہ میری مدد کرنے سے قاصر ہیں۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ سوچنا کس قدر اذیت ناک اور سوچ کو کسی مقررہ دائرے تک محدود رکھنا کتنا مشکل کام ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ دوسرے لوگ ایسی صورت میں کیا کرتے تھے۔ میری سمجھ میں تو یہی آیا کہ بھاگ جاؤں شہر چھوڑ دوں اور کسی ایسی جگہ چلا جاؤں جہاں سوچنے کی آزادی ہو کیا پتہ دوسری جگہ ذہنی فضا مختلف ہو وہاں جا کر مجھے اپنے سوالوں کے جوابات بھی مل جائیں اور میں ایک عظیم فاتح کی طرح سرخرو ہو کر لوٹوں۔

اور میں نے ہجرت کی کہ پیغمبروں کی سنت بھی تھی اور ایک اجنبی شہر میں پناہ لی اس نئے شہر کے لوگ بظاہر پہلے شہر والوں سے مختلف نہ تھے۔ مگر ان کی زبان اور کتابیں مختلف تھیں۔ اس امکان کے پیش نظر کہ شاید ان کے یہاں مجھے بعض اہم سوالوں کے جوابات مل جائیں میں نے ان کی زبان سیکھی اور ان کی کتب کا مطالعہ شروع کر دیا۔ لیکن جلد ہی مجھے یہ معلوم کر کے پریشانی سے دوچار ہونا پڑا۔ کہ ان کی سوچ بھی زیادہ مختلف نہیں تھی چنانچہ مجھے اپنے کسی سوال کا جواب نہ مل سکا اور آخر کار مجھے یہاں سے بھی رخصت ہونا پڑا

اس کے بعد میں نگر نگر گھوما۔

کئی طرح کی زبانیں سیکھیں اور کتابیں پڑھیں۔ لیکن مجھے اپنے سوالوں کے تشفی بخش جوابات کہیں سے حاصل نہ ہوئے۔ ہر جگہ لوگ ایک ہی طرح سوچتے تھے۔ اس کے باوجود ایک دوسرے کی کتابوں کو تسلیم نہ کرتے تھے۔ صرف اپنی معلومات کو مکمل اور سچ قرار دیتے تھے۔ میں مزید پریشان ہو گیا۔ سچ کیا تھا؟ کہیں تھا بھی یا نہیں؟ میں اس کا فیصلہ کرنے سے قاصر تھا۔

کتابوں سے مایوس ہو کر میں نے فیصلہ کیا کہ ارضی علم سے قطع نظر کر کے آسمان سے

براہ راست لوگاؤں اور اپنی حسیات کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے باطن سے ان سوالوں کے جوابات حاصل کروں چنانچہ میں نے دنیا تیاگ دی اور انسانی بستیوں سے دور ایک ویرانے میں ٹھکانہ کر لیا۔

میں ایک مدت تک پہاڑ کی ایک کھوہ میں پناہ لے کر گیان حاصل کرنے کے لئے ریاضت کرتا رہا۔

میں نے خود کو بہت سی اذیتیں دیں

آہستہ آہستہ میرا ماس جھڑنے لگا۔ اور ہڈیاں کڑکڑانے لگیں

میں نے اپنے اندر کی روشنی کے لئے اپنے باہر کو ایندھن بنا کر جلایا۔ اور بہت سے روحانی مدارج طے کئے۔ لیکن ایک طویل عرصہ گزر جانے کے بعد بھی مجھے وہ آواز سنائی نہ دی جس کا مجھے انتظار تھا۔ کوئی روشنی نظر نہ آئی۔ نہ کوئی صحیفہ مجھ پہ نازل ہوا۔ مایوسی میرے اندر بلکنے لگی اور نا امید ہو کر میں نے دوبارہ درختوں کے پتے اور کچے پکے پھل کھانا شروع کر دیئے۔ اور آہستہ آہستہ میری ننگی ہڈیوں پر ماس کی کونپلیں پھوٹنے لگیں

پھر اچانک ایک روز مجھے خیال آیا کہ شاید میں اب تک غلط راستوں پر بھٹکتا رہا ہوں۔ میں نے کسی راہبر کسی مرشد سے جو صحیح اور غلط راستوں کی کامل پہچان رکھتا ہو کبھی رجوع نہیں کیا۔ جونہی مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا میں نے مرشد کی تلاش شروع کر دی۔ مگر یہ سب سے مشکل کام نکلا۔ ہر کسی کا تقاضا تھا۔ کہ میں سوچنا چھوڑ دوں اور خود کو اس کے حوالے کر دوں میں سوچنا ترک کرنا اور خود کو کسی کے حوالے کرنا چاہتا تھا۔ لیکن پتہ نہیں میرے اندر کیسی بھٹی سی دہکتی رہتی تھی۔ جس سے ہر آن سوالات دھوئیں کی مانند بلند ہوتے اور ماحول کو آلودہ کرتے رہتے تھے۔ میں نے خود کو باری باری بہت سے لوگوں کے حوالے کیا جو راہبری کے دعویدار تھے۔ لیکن چونکہ میں نے سوچنا ترک نہیں کیا تھا۔ اس لئے مجھے ان کی صحبت سے محروم ہونا پڑتا۔

لیکن پھر ایسا ہوا کہ میری ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوگئی۔ جو بہت عرصہ پہلے فوت ہو چکا تھا۔ اس نے مجھے اپنی سپردگی میں لئے بغیر میرے سوالوں کے تسلی بخش جوابات دینا شروع کئے:

طمانیت سے میرا اندر بھرنے لگا۔

مجھے ایسے لگا جیسے میرے دل سے ایک کانٹا سا نکل گیا ہو۔ جیسے میرے وجود سے پتھروں کا انبار ہٹا دیا گیا ہو۔

ایک ایک کر کے میری ساری گتھیاں سلجھنے اور پہیلیاں حل ہونے لگیں اور مطلق سچ کی آگہی سے میرا اندر باہر منور ہو گیا۔

میں بہت خوش تھا۔ مجھے میری کھوئی ہوئی منزل مل گئی تھی۔ میں گھر واپس دانہ ہوا کہ اہل شہر کو مژدہ سناؤں۔ انہیں بتاؤں کہ سچ کیا ہے۔ اور اس تک رسائی کیسے حاصل کی جا سکتی ہے۔ لیکن جونہی میں شہر میں داخل ہوا ہر طرف شور مچ گیا۔

"پھر آ گیا ہے۔"

"دوبارہ زندہ ہو گیا ہے"

"وہی ہے۔ وہی ہے"

لوگ میرے چاروں طرف جمع ہونے لگے۔ وہ مجھے حیرت سے دیکھتے۔ انگلیاں اٹھاتے خوفزدہ ہو کر دور بھاگتے۔ آپس میں سرگوشیاں کرتے

پھر اچانک ننگی تلواریں لئے سپاہیوں کا ایک دستہ نمودار ہوا اور مجھے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ یہ کیوں اور کیا تھا۔ لوگوں کا ہجوم ہر آن بڑھتا جا رہا تھا۔ لگتا تھا۔ سارا شہر امڈ پڑا ہے اور ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ وہ مجھے دھکیلتے ہوئے شہر کے وسط میں اس چبوترے کے قریب لے گئے۔ جہاں سولی گڑی تھی لیکن میرا جرم؟ ——— میں نے تو ابھی سچ یا جھوٹ کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ صرف سوچا تھا۔

چبوترے پر کھڑے ہو کر میں نے ایک نگاہ انسانوں کے اس سمندر پر ڈالی جو چاروں طرف ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ ہر سو سر ہی سر تھے۔ اور شور مچا ہوا تھا۔

"وہی ہے — بالکل وہی ہے"

اچانک مجھے یاد آیا یہ منظر میں نے پہلے بھی کئی بار دیکھا ہے۔ کب اور کہاں؟ میں ابھی یاد کر رہا تھا۔ کہ انہوں نے میری آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھ دی اور میری گردن میں پھندا ڈال دیا۔

ہوا چلتی ہے۔ سورج چمکتا ہے۔ سمندر زمین کے تین چوتھائی حصّے میں بڑا ہانپتا رہتا ہے۔

گھاس اگتی ہے۔ بیلیں پھیلتی ہیں۔ پیڑ بڑھتے ہیں۔ بور آتا ہے۔ پھول کھلتے ہیں چڑیاں چہچہاتی ہیں۔ کوئل کوکتی ہے۔ بادل برستے ہیں۔ چاندنی چٹکتی ہے۔ ڈھول بجتے ہیں اور میں بنگوڑے میں لیٹا نئے نئے الفاظ سیکھنے کی مشق کرتا ہوں

بچّے اور بارود

"بی بی آپ کا نام ؟"

"کیا کہا بیٹی ذرا بلند آواز میں کہو۔"

"کیا آپ اونچا سنتی ہیں ؟"

"ہاں بیٹی — بہت اونچا سننے لگی ہوں۔"

"کیا پہلے ٹھیک سنائی دیتا تھا ؟"

"ہاں ساری آوازیں سن لیتی تھی۔ جہاں ہمارا گھر تھا۔ وہاں بہت درخت تھے۔ درختوں پر سارا دن کبوتر۔ کوّے۔ فاختائیں۔ چڑیاں اور طوطے بولتے رہتے۔ ان کی رنگارنگ آوازوں سے عجیب سماں بندھا رہتا۔ ہمارے گھر کے پاس ایک آبشار تھی۔ بارہ مہینے بہتی رہتی۔ جب بھی پیچھے پہاڑوں پر بارش ہوتی یا برف پگھلتی اس کا شور بڑھ جاتا۔ میں روٹی پکاتی جھاڑو دیتی۔ بکری دوہتی۔ اس کی آواز سنتی رہتی۔ اس کی آواز میں ذرا بھی تبدیلی آتی تو مجھے گھر بیٹھے پتہ چل جاتا کہ پانی کا کتنا بڑا ریلا آیا ہے۔ میرا مرد کھیتوں میں ہل چلاتا تو مجھے اس کی آہٹ سے پتہ چلتا رہتا۔ اب وہ کھیت کے کس حصّے میں ہے۔ وہ جنگل میں لکڑیاں کاٹنے جاتا تو مجھے گھر بیٹھے اسکے کلہاڑے کی آواز سے اندازہ ہوتا رہتا۔ اب وہ تھک گیا ہے۔ اور اسے قہوے کی ضرورت ہے۔ رات کو گھر میں کہیں چوہا حرکت کرتا تو میری آنکھ کھل جاتی

میرا بیٹا کبھی کبھی مجھے تنگ کرنے کے لئے دبے پاؤں آتا اور اچانک "ہُو" کہہ کر مجھے ڈرانا چاہتا۔ تم جانتی ہو بیٹی ماں کا دل تو بچے کے ساتھ بندھا ہوتا ہے۔ اس کا ہر پاؤں میرے دل پر پڑتا مجھے اس کے آنے کا اندازہ ہو جاتا۔ مگر میں اس کا دل رکھنے کے لئے جھوٹ موٹ ڈر جاتی۔ جس پر وہ خوش ہو کر زور زور سے ہنسنے لگتا۔

"آپ کب سے اونچا سننے لگی ہیں؟"

"اب تو بہت دِن ہو گئے بیٹی۔ دھماکوں کی آوازیں سن سن کر کانوں کے پردے پھٹ گئے ہیں۔ ایک طرح سے یہ اچھا ہی ہے۔ سننے کے لئے اب رہ ہی کیا گیا ہے"

"کیا آپ کو یاد ہے لڑائی کب اور کیسے شروع ہوئی تھی؟"

مجھے تو اتنا یاد ہے بیٹی۔ ہم امن چین سے رہتے تھے۔ ہمارا چھوٹا سا گھر تھا تھوڑے سے کھیت تھے۔ مگر ہم خوش اور مطمئن تھے۔ اللہ نے ہمیں چاند سا بیٹا دیا تھا۔ ہمارے پاس دو گدھے۔ تین بیل۔ بیس بکریاں اور بہت سی مرغیاں تھیں۔ ہاں ایک بلی بھی تھی۔ بڑی پیاری میرے بیٹے سے بڑی مانوس تھی۔ رات کو اکثر اس کے بستر میں گھس کر سو جاتی ایک بار ....."

"آپ جنگ کے بارے میں بتا رہی تھیں"

"ہاں بیٹی میں نے بالکل ٹھیک بتایا ہے۔ ہماری کسی سے لڑائی تھی نہ دشمنی اگر ہمارا کوئی جانور کسی دوسرے کے کھیتوں میں چلا جاتا تو ہم معافی مانگ لیتے کسی دوسرے کا مویشی ہمارے کھیت میں گھس آتا تو ہم معاف کر دیتے۔ کوئی اور تنازعہ ہوتا تو ہم مل بیٹھ کر نپٹا لیتے۔ ہم اپنی اور اپنے بچوں کی ہی نہیں سب کے مال و عیال کی خیر چاہتے تھے۔ کسی دوسرے کو خوش اور خوشحال دیکھ کر حسد کی آگ میں نہیں جلتے تھے۔ ہم نے لڑائی جھگڑے اور دشمنی کی ساری راہیں مسدود کر دی تھیں لیکن یہ لڑائی؟ — یہ تو بیٹی باہر سے آئی۔ کہیں اوپر سے نازل ہوئی پتہ نہیں اسکے کیا اسباب تھے۔ کون سچا تھا اور کون جھوٹا تھا۔ کون حق پر تھا اور کون گناہگار۔ ہم غریب لوگوں

کو کیا معلوم۔ بس ہمیں تو اتنا پتہ ہے بیٹی۔ ایک دن دھماکے کی آواز سنائی دی - اور سارے پنچھی دانا دنکا چگنا اور چہچہانا بھول گئے۔ فضا میں شگوفوں کی خوشبو کی جگہ بارود کی بو پھیل گئی۔ اس سے پہلے کبھی ہوائی جہاز گزرتا تھا۔ تو میرا بیٹا بھاگ کر کسی ٹیلے یا چھت پر چڑھ جاتا اور اڑتے ہوئے ہوائی جہاز کو دیکھ کر خوش ہوتا۔ مگر دھماکوں کی آواز سن کر اور یہ جان کر کہ یہ دھماکے ہوائی جہازوں نے اگلے ہیں وہ سہم گیا اور ہوائی جہاز کی آواز سن کر بدکنے لگا۔ بھاگ کر سب سے پہلے ان خندقوں میں گھس جاتا۔ جو ہم نے بڑے بوڑھوں کی ہدایت پر گھروں کے قریب کھود لی تھیں۔

"سنا ہے آپ کے میاں نے نہایت بہادری سے لڑتے ہوئے جان دی"

"میں سمجھی نہیں بیٹی۔ ذرا اونچا بولو"

"آپ کے میاں کے بارے میں پوچھ رہی ہوں"۔

"اچھا اچھا —— بس بیٹی اچھا آدمی تھا۔ محنتی اور ایماندار۔ اپنے کام سے کام رکھتا تھا بیٹے سے اسے بہت محبت تھی کام کاج سے لوٹتا تو سب سے پہلے اسی کا پوچھتا چوم چوم کر اس کے گال سرخ کر دیتا۔ کہتا تھا۔ اسے پیار کر کے ساری تھکاوٹ اتر جاتی ہے۔ وہ اسے پڑھانا لکھانا چاہتا تھا۔ اسے بڑا آدمی بنانا چاہتا تھا جب وہ پانچ سال کا ہوا تو ہم نے اسے بڑے گاؤں کے سکول میں داخل کر دیا۔ شروع شروع میں وہ خود اسے کندھوں پر بٹھا کر سکول لاتا اور لے جاتا تھا۔ پھر وہ ہم عمروں کے ساتھ خود آنے جانے لگا۔ مگر اسے اس کی بڑی فکر رہتی۔ ذرا دیر ہو جاتی تو بے چین ہو جاتا۔ بچوں سے تو سبھی محبت کرتے ہیں بیٹی مگر میرا میاں تو جیسے اپنے بیٹے کا عاشق تھا۔ وہ تھا بھی بڑا خوبصورت، بھولا بھالا اور پیارا۔ مگر اچھی چیزیں برے لوگوں کے پاس زیادہ دیر کہاں رہتی ہیں۔ ہم بُرے تھے بیٹی کیوں کہ ہم اسکی حفاظت نہ کر سکے۔ اسے تو ہمارے گھر میں پیدا ہی نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ وہ تو شکل و صورت سے ہی کسی اور دنیا کی مخلوق نظر آتا تھا

کیا ہی اچھا ہوتا وہ کسی دوسری قوم، قبیلے یا ملک میں پیدا ہو جاتا۔

"میں آپ کے میاں کی شہادت کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔"

"ہاں بیٹی — وہ شہید ہو گیا۔ شہید ہی سمجھو۔ جب لڑائی طول پکڑ گئی اور آدمیوں کی کمی ہو گئی۔ تو اسے بھی پکڑ کر لے گئے۔ مگر اسے ہل چلانا آتا تھا۔ بندوق نہیں۔ اور لڑائی جھگڑے سے تو اسے بہت ہی وحشت ہوتی تھی۔"

"مگر میں نے سنا ہے۔ اس نے نہایت جرات کا مظاہرہ کیا اپنے جسم کے ساتھ بم باندھ کر دشمن کے ٹھکانے میں گھس گیا۔"

"میں نے بھی یہی سنا ہے بیٹی۔ ٹھیک ہی کہتے ہوں گے۔

"آپ نے اتنا عرصہ اس کے ساتھ گذارا ہے۔ آپ کچھ اس کے بارے میں تفصیل سے بتائیں۔"

"میں کیا بتا سکتی ہوں بیٹی۔ انسان کو بدلتے کیا دیر لگتی ہے۔ میں تو اسے اس حیثیت سے جانتی تھی۔ کہ اس نے کبھی چیونٹی تک کو ہلاک نہیں کیا۔ میں نے تو اسے کبھی کسی مویشی کو مارتے پیٹتے بھی نہیں دیکھا۔ ہو سکتا ہے بھرتی کے بعد اس میں تبدیلی آگئی ہو۔ لیکن مجھے اتنا ضرور یقین ہے وہ مزا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اپنے محبوب بیٹے کو چھوڑ کر کیسے مر سکتا تھا؟"

"تو کیا اس وقت آپ کا بیٹا زندہ تھا۔؟"

"ہاں — اس وقت وہ بالکل سلامت تھا۔ یہ تو بہت بعد کی بات ہے، جب جوان آدمی نہیں ملتے تھے۔ اور بچوں عورتوں اور بوڑھوں کو بھرتی کیا گیا۔"

"کیا آپ کے بیٹے کو بھی بھرتی کیا گیا تھا؟"

"بھرتی ہی سمجھو بیٹی — ایک دن سکول سے واپس آیا تو کہنے لگا۔ کہ اگلے روز اس کے اسکول کا معائنہ کرنے بڑے افسر آرہے ہیں۔ اس لئے استاد نے ہدایت کی ہے

کہ صاف ستھرے کپڑے پہن کر آنا۔ میں نے اس کی حجامت بنوائی۔ ناخن کاٹے، نہلایا دھلایا۔ اس کے سر میں خوشبودار تیل لگایا اور اچھے اچھے کپڑے پہنا کر رخصت کیا۔ آہ مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ مجھ سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ جائے گا۔ اگر مجھے ذرا سا بھی شبہ ہوتا تو میں اُسے کبھی نہ جانے دیتی۔ اسے لے کر کہیں دور چلی جاتی۔ کسی غار میں پناہ لیتی پاتال میں چھپ جاتی۔"

"اچھا تو وہ سکول سے واپس نہ آیا؟"

"ایک وہی نہیں اور بھی بہت سے بچے واپس نہیں آئے۔ میں نے بتایا نا — جوان آدمیوں کی سخت کمی ہو گئی تھی۔ انہوں نے بوڑھوں عورتوں اور بچوں سے یہ کمی پوری کرنا چاہی۔"

"کیا بچے بھی بندوقیں چلاتے تھے؟"

"ان کے ذمے اور طرح کے کئی کام تھے۔ بندوقچیوں کو اسلحہ بارود فراہم کرنا۔ ان کا سامان اٹھانا۔ دشمن کی نقل و حرکت کی خبر دینا اور خبر رسانی کرنا۔ لیکن میرا بچہ"

"آپ کے بچے کی کیا ڈیوٹی تھی؟"

"دشمن جس علاقے سے پسپا ہوا تھا۔ وہاں اس نے جگہ جگہ بارودی سرنگیں بچھا دی تھیں۔ باقاعدہ فوج آگے بڑھنے سے پہلے بچوں کو آگے بھیج کر معلوم کرتی تھی۔ کہ وہاں بارودی سرنگیں تو نہیں ہیں، میرے بیٹے کا ایک ساتھی جو بُری طرح زخمی ہو گیا تھا بتاتا تھا۔ کہ ان کی ریس لگوائی گئی تھی۔ اور کہا گیا تھا۔ کہ جو چکر لگا کر پہلے واپس آئے گا۔ اسے انعام دیا جائے گا۔ وہ اس بات سے بے خبر کہ وہ زمین جوان کے لئے پھل پھول اور اناج اگاتی تھی۔ اس میں بارود بو دیا گیا تھا۔ بھاگتے رہے۔ میرا بیٹا بہت تیز دوڑتا تھا۔ ہمیشہ دوڑوں میں اوّل آتا تھا۔ وہ اس روز بھی آگے نکل گیا اور ساری سرحدیں پار کر گیا۔"

"مجھے آپ کے دکھ کا اندازہ ہے۔"

"تمہیں کیسے اندازہ ہو سکتا ہے بیٹی ۔ کسی کو بھی اندازہ نہیں ہو سکتا۔ صرف وہی ماں میرا دکھ جان سکتی ہے جس کا ایک ہی بیٹا ہو اور اسے بارودی سرنگوں سے اٹی زمین پر دوڑایا جا رہا ہو۔"

"آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ لیکن ہم سب بارودی سرنگوں پر چل پھر رہے ہیں۔ پتہ نہیں کب کون بھک سے اڑ جائے۔ اچھا آپ کا بہت بہت شکریہ۔ کیا آپ بہنوں کے نام کوئی پیغام دینا چاہتی ہیں؟"

"ہاں ۔ میری دُنیا کی تمام بہنوں سے اپیل ہے کہ جب تک پہلے جنے ہوئے خونریزیوں سے باز نہ آجائیں بچے پیدا کرنا چھوڑ دیں۔"

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے
ہیں مزید اس طرح کی شان دار،
مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے
ہمارے وٹس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پینل

عبداللہ عتیق : 03478848884

سدرہ طاہر : 03340120123

حسنین سیالوی : 03056406067

محمد منشا یاد

پیدائش : ۵ ستمبر ۱۹۳۷ء ——— ضلع شیخوپورہ

تعلیم : ایم اے اردو ——— ایم اے پنجابی ——— ڈپلومہ سول انجینیرنگ

مُلازمت : ڈپٹی ڈائریکٹر ——— کیپٹل ڈیویلپمنٹ اتھارٹی اسلام آباد